للکار



نریش کمار شاد

مکتبۂ شاہراہ، دہلی

پہلی بار ۱۰۰۰
قیمت دو روپے چار آنے

فروری سنہ ۱۹۵۲ء

نعمانی پریس دہلی

عوام کے نام ——

جو للکار بن کر ان نظموں میں گونج رہے ہیں

ترتیب

ابتدائیہ

یہ مجموعہ مختلف زبانوں کے آٹھ نامور اور نمائندہ عوامی اور انقلابی شاعروں کی ایسی نظموں پر مشتمل ہے جو مجھے بے حد محبوب ہیں اور جو ظالم اور خونخوار قوتوں کے خلاف فنی اور تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جن کی آفاقی گونج میں جہاں فاشزم اور شہنشاہیت کے خلاف حقارت اور غصے کی چنگاریاں بھڑک رہی ہیں وہاں ابھرتی اور آگے بڑھتی ہوئی زندگی کا آہنگ بھی رچا ہوا ہے۔ اسی رعایت سے میں نے کتاب کا نام "للکار" تجویز کیا ہے اور ہر شاعر کی منظومات سے پہلے اس کی ذاتی زندگی کے چند ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جو اس کے فن پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔

ان نظموں کا انداز بیاں اردو نظم کے مروجہ اور روایتی اسلوب سے کچھ کچھ علیحدہ اور کہیں کہیں سے کٹا کٹا بھی محسوس ہوگا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ایک زبان کی نظم کے خیال کی نشریت اور الفاظ کی موسیقیت کی خوشبو جوں کی توں دوسری زبان کے اسلوب و بیاں کے پھولوں میں منتقل نہیں ہو سکتی۔ ایسے کسی حد تک مترجم کی فنی کمزوری پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے: تاہم اس سائنسی حقیقت سے انحراف ممکن نہیں کہ ہر ملک کے علم و فن پر وہاں کی مخصوص لسانی، سماجی اور تہذیبی فضا کی چھاپ ہوتی ہے اور یہاں یہی چھاپ ان ترجمہ کی ہوئی نظموں کی متعدد ترکیبوں، استعاروں اور تشبیہوں کی اجنبیت کا موجب ہے۔

یہاں میں بعض نظموں کے پس منظر کے بارے میں بھی کچھ باتیں بتا دینا ضروری خیال کرتا ہوں۔ خٹک شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نڈر اور بہادر جنگجو بھی تھا۔ اسی لیے اس کی شاعری بھی آمریت کے خلاف ایک مضبوط اور موثر ہتھیار کا درجہ رکھتی ہے اور اس کے جوشیلے نغموں کی روح میں اس کے عمل اور تجربے کی جھنکار گونجتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

اپنی نظم "مغل" میں اس نے ایمل خاں اور دریا خاں کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ دونوں خٹک کے

نہایت قابل اور جری جرنیل تھے اور انھوں نے آخر دم تک خٹک کا ساتھ دیا تھا۔ وہ اس کے دوش بدوش اورنگ زیب کی بہیمیت اور شہنشاہیت کے خلاف نبرد آزما رہے تھے۔ خٹک کو اپنے ان دونوں جرنیلوں سے بے حد عقیدت تھی۔ اور ان کی قابلیت اور شجاعت پر بڑا ناز تھا۔ اور ان کی موت پر اسے واقعی بہت گہرا صدمہ پہنچا تھا۔ جس کا اظہار اس نے مذکورہ نظم کے علاوہ اپنی اور بھی کئی نظموں میں کیا ہے۔

اپنی دوسری نظم "حمیت" میں مغل سامراج کے افغان کش اقدامات کے خلاف بھرپور نفرت کا اعلان کرنے کے ساتھ ساتھ خٹک نے اپنے سادہ لوح ہم وطنوں کو بیداری اور عمل کا درس بھی دیا ہے۔

پشکن کے عہد میں زار شاہی کے قہر و غضب کا دور دورہ تھا اور روسی کسان بری طرح زرعی نظام کی چکی میں پس رہا تھا۔ پشکن کی نظم "گاؤں" زرعی نظام کی چیرہ دستیوں کی لرزہ خیز اور دردناک تصویر ہی نہیں بلکہ زراعت کی اجارہ داری کے خلاف ایک واضح اور ٹھوس احتجاج بھی ہے۔

"بشارت" دراصل اس کی نظم "شادئیف کے نام" کا آزاد ترجمہ ہے اور اس نظم کے مجموعی تاثر اور مرکزی خیال کو اپنی پوری شدت سے ابھارنے کے لئے مجھے انداز بیاں میں معمولی تنسیخ و تصرف سے کام لینا پڑا ہے۔

"سائبیریا کے رفیقوں کے نام" ان باغیوں سے متعلق ہے جنہیں دسمبر ۱۸۲۵ء کی بغاوت میں حصہ لینے کے جرم میں جلاوطن کر دیا گیا تھا اور جن میں اکثر پشکن کے ذاتی دوست اور ہم جماعت بھی شامل تھے۔ اس ضمن میں پیشچن، اور کوچل بیکر کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

"گھن گرج" مایاکافسکی کی At the top of my voice کا ترجمہ ہے اس کی وفات کے بعد اس کے ادھورے مضامین اور نامکمل منظومات کے جو مسودات ملے ان میں یہ نظم نہایت اہم اور ممتاز قرار دی گئی ہے۔ اور اس کے بارے میں مستند نقادوں کی متفقہ رائے یہ ہے کہ اگر مایاکافسکی اسے مکمل کر لیتا تو یہ نظم دنیا کے عظیم فن پاروں میں شمار ہوتی۔

"ایفل ٹاور" پیرس کا مشہور اور بلند ٹاور ہے۔ ۱۹۲۵ء میں مایاکافسکی نے اپنے فرانس

کے سفر کے دوران میں اس ٹاور کو دیکھ کر اپنی نظم "ایفل ٹاور" لکھی تھی۔ اس زمانے میں فرانس کی عوامی جدوجہد کافی سست اور کمزور تھی اور مایکافسکی نے اپنی اس نظم میں ایفل ٹاور کو وہاں کی عوامی جدوجہد کا سمبل بنا کر اسے روس کی انقلابی طاقتوں کے ساتھ اپنا ناطہ قائم کرنے کی دعوت دی ہے تاکہ وہ اپنے اندر سرگرمی اور سربلندی پیدا کر سکے۔

ماؤ کی "لال فوج" (Red Army) کے پیچھے چینی عوام کی جدوجہد کی انقلابی داستان ہے۔ ۱۹۲۲ء میں جنرل چیانگ کائی شیک نے سُرخ مقبوضات کے اردگرد عسکری حصار باندھ دیا تھا۔ جس کی وجہ سے لال فوج کو (جس میں تقریباً ایک لاکھ افراد شریک تھے) پورے چھ ہزار میل کی پسپائی برداشت کرنا پڑی تھی۔ جس کو اپنی اصطلاح میں وہ لانگ مارچ کہتے ہیں۔ ماؤ نے یہ نظم لانگ مارچ کے دوران ہی میں لال فوج کے حوصلوں کو تیز کرنے کے لئے لکھی تھی۔ اس لئے چینی انقلاب کی تاریخ میں یہ ایک غیر فانی ترانے کا رتبہ رکھتی ہے۔ کیونکہ اس کو گاتے گاتے لال فوج کے سخت جان سپاہی بارہ مختلف صوبوں میں گھومنے پھرنے کے بعد اور تین سو چھوٹی بڑی لڑائیاں لڑ کر ایک چھوٹے سے صوبے شانسی پر قابض ہوئے تھے اور یہیں نان کو دارالحکومت بنا کر انہوں نے عوامی جمہوریہ کا سنگِ بنیاد رکھا تھا۔

پبلو نرودا کی "مذمت" کا پس منظر تباہ شدہ میڈرڈ ہے۔ جب فرانکو کے فاشسٹ سپاہیوں نے میڈرڈ میں قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا تھا جب انہوں نے ہزاروں معصوم ہسپانویوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور جب ان گنت ہسپانوی عوام گولیوں کا نشانہ بن گئے تھے۔ جن میں پبلو نرودا کے بیشتر دوستوں کے علاوہ اس کا عزیز ادیب ساتھی فریڈریکو گارسیا لورکا بھی ان کی بہیمت اور بربریت کی نذر ہو گیا تھا۔ تب پبلو نرودا نے ان شہیدوں کی یاد میں اور میڈرڈ کی تباہ حالی کے باوجود ہسپانیہ کے لوگوں کے تاریخی جہاد سے متاثر ہو کر یہ نظم لکھی تھی۔

"اسٹالن گراڈ" دوسری جنگِ عظیم سے متعلق ہے جب اسٹالن گراڈ میں فاشی اور عوامی قوتوں کا تاریخی تصادم ہوا تھا۔ اور جب اسٹالن گراڈ کی گلی گلی میدانِ کارزار بن گئی تھی اور روسی سرفروشوں نے اتحادیوں (فرانس۔ انگلینڈ۔ اور امریکہ) سے مل کر بپھری ہوئی نازیت کو کلہ توڑ جواب دیا تھا۔

ایلیا اہرن برگ کے بقول نیرودا کی اس نظم میں وہ سادگی ہے جسے ایک مخلص گمبھیر فن کار اپنی مسلسل ذہنی ریاضت، جستجو اور ایثار سے حاصل کرتا ہے۔

"وضاحت" اور "اسٹالن گراڈ" یہ دونوں نظمیں نیرودا کے مجموعہ Paradise on the earth سے لی گئی ہیں اور تیسری نظم "آرزو" اس کی تازہ ترین تخلیق I want the Earth کا ترجمہ ہے جس میں اس نے اپنے اس معاشی نظریے کو ظاہر کیا ہے جو عوام کی زندگی میں امن اور مسرت کا امرت گھول سکتا ہے اور جس کی وجہ سے حکومت نے اسے معتوب قرار دے کر آج تک جلا وطن کر رکھا ہے۔

لوئی اراگاؤں کی "فن" اس زمانے کی پیداوار ہے جب وہ اپنی شاعری کو مادرائیت کے گورکھ دھندوں سے نکال کر عام انسانوں کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ کر رہا تھا۔ اس کے اس ذہنی انقلاب کا سبب بہت حد تک اس کی بیوی السا ترولیٹ تھی جو خود ایک ادیبہ ہونے کے علاوہ عوامی تحریک کی بھی ایک سرکردہ کارکن تھی۔ اراگاؤں نے اپنی اس نظم میں اسے موضوعِ سخن بنا کر اپنی شاعری کے رجحان کی تبدیلی اور اپنی پیچیدہ بیانی کو ترک کرنے کی وجہ بیان کی ہے۔

ناظم حکمت کی پانچوں نظمیں، اس کی طویل و طویل نظر بندی کی دین ہیں، اسی لئے ان میں ایک نئی اور خوشحال زندگی کی لطافت اور مسرت کے ساتھ ساتھ قید و بند کی صعوبتوں کے تلخ اور کٹیلے تجربوں کی کسک بھی شامل ہے۔ "موت" "تمہارے ہاتھ" اور "بیوی کے نام" ۱۹۴۷ء سے پہلے کی لکھی ہوئی نظمیں ہیں۔ "بیسویں صدی" اور "جشنِ انقلاب" بعد میں لکھی گئی تھیں۔

نریش کمار شاد



خوشحال خان خٹک

خوشحال خاں خٹک

ایک غیرت مند انسان کے لئے دُنیا میں دو ہی
کام ہوتے ہیں یا تو وہ کامران ہوتا ہے یا اپنا سر
قربان کر دیتا ہے۔ آزادی بادشاہی سے بڑھ
کر ہے اور دوسرے کا تابع فرمان ہونا ہی تو
غلامی ہے۔

(خٹک)

خوشحال خاں خٹک سرحد کا حریت پسند اور بے باک جرنیل اور پشتو زبان کا سب سے بڑا اور قادرالکلام شاعر تھا۔ اس کی زندگی کی جد وجہد کے آئینے میں افغانستان کی ادبی اور سیاسی تاریخ کا دورِ بیداری کروٹ کروٹ جلوہ گر ہے۔

سنہ ۱۶۱۳ء میں وہ اکوڑہ میں پیدا ہوا۔ اس وقت اس کے وطن پر مغلوں کی حکومت تھی اور اس کا باپ شہباز خاں خٹک قوم کا ایک جری اور غیور سردار تھا اور شاہ جہاں کے دربار میں منصبداری کے عہدے پر فائز تھا۔ سنہ ۱۶۴۰ء میں جب شہباز خاں قبائلی خانہ جنگی کا شکار ہو کر انتقال کر گیا تو خٹک اپنی قوم کا سردار مقرر ہوا۔ شاہ جہاں اپنے دورِ حکومت میں خٹک کی شجاعت اور حمیت کو کافی تعظیم و احترام کی نظر سے دیکھتا رہا لیکن بعد میں جب اورنگ زیب تخت نشین ہوا تو خٹک اسے کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا۔ کیونکہ وہ اورنگ زیب کی ہوسِ ملک گیری کی بھٹی میں پٹھانوں کو جھونکنے اور ان میں پھوٹ ڈال کر حکومت کرنے کی آمرانہ اور افغان کش پالیسی کے خلاف کھلم کھلا بغاوت کرنے لگا تھا۔ آخر اورنگ زیب نے ایک گہری سازش کے ذریعے خٹک کو پشاور بلا کر گرفتار کر لیا اور اسے دہلی

اور تھمبور کے قلعوں میں قید و بند کی طرح طرح کی صعوبتیں پہنچانی شروع کر دیں۔ لیکن ان صعوبتوں کے باوجود خٹک کے باغیانہ عزائم کا آتش فشاں سرد نہ ہو سکا اور وہ برابر اپنی نظموں میں پٹھانوں کو آزادی اور انقلاب کا پیغام دیتا رہا۔ چنانچہ جب آزادی کی تحریک تیز ہو گئی اور پشاور کے پختون بھڑک اٹھے تو گرفتاری کے تین سال بعد اورنگ زیب خٹک کو رہا کرنے پر مجبور ہو گیا۔

اس کے بعد خٹک اگرچہ اپنی قوم کے باہمی نفاق کی وجہ سے اپنے انقلابی مقاصد سے عہدہ برا نہیں ہو سکا۔ تاہم زندگی بھر مغل شہنشاہت سے نبرد آزما رہا۔ ستر سال کی عمر میں اس کی بینائی ضائع ہو گئی۔ اور ۷۷ سال کی عمر میں اس نے وفات پائی۔

خٹک تلوار اور قلم دونوں کا دھنی تھا۔ اس کی تصنیفات کی تعداد اڑھائی سو کے لگ بھگ ہے اور اس نے پشتو ادب کی محراب میں سچی ملکی ملی اور عوامی شاعری کی وہ قندیل روشن کی ہے جسے وقت و حالات کی کوئی کروٹ گل نہیں کر سکتی۔

مغل

جب نگاہ پڑتی ہے   آج کل کے مغلوں پر

دیکھتا ہوں پہلے سے   طور اب نہیں باقی
اُن کے تیغ و خنجر کا   دور اب نہیں باقی
اب فقط قلم ان کا   رہ گیا ہے پاس اُن کے
دے کے طمع مال و زر   مختلف فریبوں سے
سادہ دِل پٹھانوں کو   پھانستے ہیں وُہ اکثر

لیکن اُن کی چالوں کا کچھ اثر نہیں مجھ پر
فضلِ ربّ عالم سے زاغ ہوں نہ مکھی ہوں

میل اور غلاظت کے ڈھیر پر جو منڈلاؤں
اس فضائے ہستی میں مَیں ہوں باز اور شاہیں

اپنے صید کو پا کر قلب ہے نشاط آگیں
میری چشمِ دل پھر بھی اس لئے لہو روئی

ایک بھی مرے جیسا خان ہے کہاں کوئی
عزّت اور عظمت سے ایمل اور دریا خاں

چل بسے ہیں دنیا سے اب ہیں خلد کے مہماں
اور مفارقت اُن کی بن گئی ہے وجہِ غم

ذہن و دل پہ طاری ہے درد و یاس کا عالم

حمیت

جس کے کانوں میں بھی پہنچتی ہے
میری شمشیرِ تیز کی جھنکار
فرطِ دہشت سے تھرتھراتا ہوا
چارپائی سے اب بھی گرتا ہے
آؤ دیکھو کہ اس زمانے میں
میں ہی تو ہوں وہ اک جوانِ ہمت

جس نے اورنگ زیب کے دِل کو
زخم آلود و داغ دار کیا
ایک خیبر پہ ہی نہیں موقوف
آج مغلوں کے واسطے مَیں نے
ملک بھر کو بنا دِیا خیبر
اور وہ ہر جگہ پٹھانوں کو
ہو کے مجبور دے رہے ہیں خراج
ہیں ارادے کئی مرے دِل میں
وائے افسوس کیا کروں کیونکہ
آج افغان بے جمعیّت ہیں



پشکن

پشکن

بدکردار ظالم بادشاہو!
میں تمہارے تخت وتاج سے نفرت کرتا ہوں تمہاری
تیرہ بختی اور تمہاری موت پر ایک سنگ دل انسان
کی طرح خوش ہوتا ہوں۔

(پشکن)

روسی زبان کا سب سے بڑا شاعر اور ترقی پسند ادب کا عظیم ترین راہ نما الگزینڈر سیرگے وچ پشکن ۶ جون ۱۷۹۹ء کو ماسکو میں پیدا ہوا۔ اس زمانے میں روس کے سماجی اور معاشی نظام پر زارشاہی اپنی پوری بربریت اور بہیمیت کے ساتھ برسر اقتدار تھی اور اسی بربریت اور بہیمیت کی کوکھ ہی سے روسی فوج اور روس کے تعلیم یافتہ متوسط درجے کے شرفا میں حکومت سے نفرت اور بغاوت کے جذبات جنم لے رہے تھے۔ انہیں جذبات کے گہوارے میں پشکن کا ذہن۔ اس کی زندگی اور اس کا آرٹ پروان چڑھا۔

اس کی ابتدائی تعلیم و تربیت بارہ سال تک اپنے گھر ہی میں ہوئی۔ بعد ازاں اسے اس وقت کی بہترین درسگاہ لیسیم میں تحصیلِ علم کے داخل کرایا گیا۔ یہاں چھ سال کے دوران میں اس نے یورپ اور یونان کے کلاسیکی ادب کے علاوہ والٹیر کی تصنیفات کا بھی مطالعہ کیا اور اسی ماحول میں اسے شعر کہنے کا ذوق پیدا ہوا۔

بعد ازاں اس نے بدیشی وزارت میں ملازمت اختیار کر لی۔ اور ملازمت کے زمانے ہی میں اپنی نظموں میں کلیسا اور ریاست کے اعلیٰ اور حقوق یافتہ افراد (جن میں زار بھی

شامل تھا) کی بدعنوانیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ انہیں نظموں کی وجہ سے سنہ ۱۸۲۰ء میں اسے جنوبی روس میں جلاوطن کر دیا گیا۔ لیکن یہ جلاوطنی اس کے باغیانہ مزاج کی نشوونما کے لئے اور زیادہ مفید ثابت ہوئی۔ یہاں اس نے اپنی تخلیقی قوتوں کو پورے طور پر باغیوں کی جنوبی انجمن کی تحریک سے منسلک کر دیا۔ سنہ ۱۸۲۴ء میں جب اسے جنوب سے شمال میں منتقل کیا گیا تو وہ شمالی روس کی پچھڑی ہوئی زندگی کی رگوں میں جاگرتی کی لہریں دوڑانے لگا۔ چنانچہ جب ۱۴ دسمبر ۱۸۲۵ء کو سینٹ پیٹر برگ میں انقلابی رُوسا کی بغاوت ناکام ہوئی تو اس بغاوت میں حصہ لینے والوں کے قبضے سے پشکن کے لکھے ہوئے مسودات بھی برآمد ہوئے۔

۱۰ فروری ۱۸۲۶ء کو یہ عظیم شاعر انتقال کر گیا۔

میکسم گورکی کے الفاظ میں پشکن بلاشبہ ہماری دُنیا کا سب سے بڑا فن کار ہے۔

گاؤں

(۱)

لہلہاتے خوشنما کھیتوں پہاڑوں وادیوں کے درمیاں
لرزہ براندام ہو جاتا ہے وہ انسان بھی
جان سے بڑھ کر جسے محبوب ہو انسانیت
دیکھتا ہے جب یہاں
ایک اک چہرے پہ کندہ ہیں جہالت کے نقوش
اور ان کے خون سے پاتی ہے اب تک پرورش
سنگدل مغرور اور قانون سے بے بہرہ آقاؤں کی نسل

جو ہے اندھی دوسروں کے آنسوؤں کے واسطے
جو ہے بہری دوسروں کی آہ و زاری کے لئے
منتخب جس کو کیا ہے اس لئے تقدیر نے
کر سکے وُہ دوسروں کی زندگی کو پائمال
چھینتی ہے اپنے ہاتھوں میں جو ہنٹر تھام کر
اک کساں کی ساری محنت ۔ سارا غلّہ ، اور ساری زندگی
اور وہ مجبور کا جفاکش تازیانے کا غلام
افتاں و خیزاں چلاتا ہے کرائے کا جو ہل
کھینچ دیتا ہے زمیں کے سینۂ خاموش پر
اپنے ان سفاک آقاؤں کی قسمت کی لکیریں جا بجا
جن کے پتھر دل پگھل سکتے نہیں
بے کسی کی التجاؤں سے کبھی

(۲)

اور یہاں ـــــــــ

عام انسانوں کے شانوں پر دھرا رہتا ہے بارِ دردِ و غم

اور دوشیزائیں بھی مجبور ہیں

اپنے دل کی آرزوئیں اپنے ہاتھوں سے کچلنے کے لئے

چاہیں بھی تو شے نہیں سکتیں محبّت کا محبّت سے جواب

ان پہ آتی ہے جوانی اس لئے

تاکہ وہ

اپنے آقاؤں کے سینے میں ہوس کی آگ ٹھنڈی کر سکیں

اور یہاں ـــــــــ

ایک محنت کش کا بیٹا ایک تیرہ بخت کا لختِ جگر

اپنی ماں اور باپ کے اشکوں کا ساتھی اور بڑھاپے کا عصا

اِس لئے ہوتا ہے پیدا تاکہ وُہ
بادشاہِ وقت کے محلوں کی دربانی کرے

(۳)

آہ کیا یہ ہو نہیں سکتا کہ میری شاعری
ان کے خوابیدہ دماغ و دل میں بیداری کے شعلے پھُونک دے
میرا سینہ کیوں جلا جاتا ہے آخر آتشِ بے فیض سے
کس لئے میری زباں شعلے اُگل دیتی نہیں

دوستو ——— !
کیا کبھی دیکھونگا اپنی قوم کو آزاد اور بیدار بھی
کیا زراعت کا اجارہ مٹ سکے گا حرفِ باطل کی طرح
کیا مرے پیارے وطن میں مہرِ آزادی کبھی
دے سکیگا اک نئی اور خوبصورت صبحِ تاباں کو جنم

بشارت

شوخ خوابوں کے جال ٹوٹ گئے
زندگی اب اٹل حقیقت ہے
ہر نفس تند و تیز ہے جیسے
گردشِ وقت سے عبارت ہے

جاگ اٹھا بڑے خروش کے ساتھ
اپنی کچلی ہوئی زمیں کا شعور

آ گیا کام دردِ ناکامی
پس پڑا ظلم و جور کا ناسور

ایک اک نوجواں ہے سینہ سپر
اپنی آزادیٔ وطن کے لیے
سب کے سینوں سے اٹھ رہا ہے دھواں
سب کی آنکھوں میں جل رہے ہیں دیے

اک نئے انقلاب کی خواہش
ذرے ذرے کا دل ابھارتی ہے
ہر گھڑی نغمۂ جرس کی طرح
اک نئے دور کو پکارتی ہے

اب وہ لمحاتِ نور دور نہیں
آئے گی جب رخِ وطن پہ بہار
روس خوابِ گراں سے چونکے گا
منزلیں ہوں گی راستوں کا غبار

ٹوٹ جائیں گے سلطنتوں کے غرور
تخت اکھڑیں گے تاج ڈھلکیں گے
اور اُن کے شکستہ ہیروں میں
سرفروشوں کے نام جھلکیں گے

سائبیریا کے رفیقوں کے نام

اے سائبیریا کے رفیقانِ انقلاب
تم ان عمیق کانوں میں ثابت قدم رہو
مغرور ہو کے دولتِ صبر و شکیب پر
کچھ اور دن یہ قید کے رنج و الم سہو

مجھ کو یقین ہے کہ تمہاری حیات پر
سایہ نہ پڑ سکے گا شکست و ملال کا

جائیگی رائگاں نہ تمہاری یہ جد و جہد
خُم ہو سکے گا سر نہ تمہارے خیال کا

امید قید خانے کے تیرہ سکوت میں
دیتی ہے جگمگا کے یہ جرأت فزا پیام
"مطلوب دن تمہارا بہت جلد آئے گا
ہوگی تمہاری زیست بہر طور شاد کام"

یُوں چھن رہی ہے مہر و محبّت کی روشنی
زندانِ ہولناک کی شب ہائے تار سے
جیسے پہنچ رہے ہیں مقیّد فضاؤں میں
میرے یہ پُر امید یہ آزاد زمزمے

ٹوٹیں گے ایک گونج سے زنداں کے بام و در
کٹ جائینگے یہ طوق و سلاسل بھی ایک دم
اک سیلِ نور ہے کہ پھر آزادیٔ حیات
خوش آمدید تم کو کہے گی بہر قدم

اور پھر تمہارے بچھڑے ہوئے باوفا رفیق
بخشیں گے اک نشاط و طرب کا جہاں تمہیں
چھینا تھا جن کو اہلِ حکومت کے جور نے
لوٹائیں گے تمہارے وہ تیغ و سناں تمہیں

تحریک

اے دوست! یہ سکون سے نا آشنا حیات

ہے آرزوئے امن میں بے تاب و بے قرار

اٹھیں کہ آج وقت ہے تحصیلِ امن کا

ہے تیز گام توسنِ ایّامِ روزگار

وابستہ جس سے پیار ہے اپنی حیات کا

ہر لمحۂ گریزاں ہے اِک ایسا شاہکار

آؤ حلف اُٹھائیں کہ زندہ رہیں گے ہم
اور ہوں گے لازوال مسرّت سے ہم کنار

اپنی امنگ اپنی امیدوں کی جان ہے
ارضِ وطن رہی ہے جو آلام کا شکار

ہم مل کے جہل اور غلامی کا یہ نقاب
اس کے حسین رُخ سے اٹھائیں جو ایک بار

لہرائے کائنات فضا جگمگا اُٹھے
ہو جائیں جلوہ ہائے مہ و مہر شرمسار



مائکافسکی

مائیکافسکی

سرمایہ داری کی بنیادیں جن کی تعمیر اس قدر مضبوط ہے۔
ابھرتی ہوئی بغاوت کے سامنے کانپ رہی ہیں تڑخ رہی
ہیں۔ آگے بڑھتے ہوئے برسوں کی گرج دار آواز سنو۔ یہ
انسانی ارتقا کا جمع شدہ غصہ ہے۔ ایک سرکشی کا طوفان
ہے جس کی بجلیاں جھلس دیتی ہیں اور بغاوت کے شعلے
عوامی انقلاب بن جاتے ہیں

(مائیکافسکی)

جدید روس کا سب سے زیادہ محبوب اور مقبول عوامی شاعر ـــــــ جس کی منظومات کے مجموعے لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہو چکے ہیں اور جس کے نام پر روس کے اسکوائروں اور اسٹیشنوں کے نام رکھے گئے ہیں۔

مایاکافسکی ایک عظیم طباع اور خلّاق شاعر ہونے کے علاوہ انتہائی بذلہ سنج اور ایک اعلیٰ پایہ کا تصویر کش اور مجسمہ ساز بھی تھا۔

وہ ۱۸۹۳ء میں جارجیا کے ایک چھوٹے سے گاؤں بغدادی میں پیدا ہوا۔ ۱۹۰۶ء میں والد کے انتقال کے بعد وہ اپنی ماں کے ساتھ ماسکو آ گیا اور یہیں سے اس کی زندگی نے ایک اہم ترین اور زبردست انقلابی کروٹ لی۔ اسے اشتراکیت کو سمجھنے اور اس کے قریب آنے کا موقع ملا۔ اور ۱۹۰۸ء میں وہ باقاعدہ طور پر بالشویک پارٹی کا ممبر بن گیا۔ اور پریس کے کارکنوں اور جوتے بنانے والے مزدوروں میں تنظیمی کام کرنے لگا۔ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۲ء تک اس کے عزم و عمل کی سرگرمیاں اپنے پورے اوج پر تھیں۔ وہ تاس نیوز ایجنسی میں اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے متواتر کام کرتا رہتا تھا نظمیں کہنے۔ پوسٹر بنانے اور تقریریں کرنے کے

علاوہ اس نے اسی دوران میں تین فلمی کہانیاں بھی لکھیں اور ان فلموں میں خود ہیرو کا رول ادا کیا۔

۱۴ اپریل ۱۹۳۰ء کو ۳۷ سال کی عمر میں اپنے غدار ساتھیوں کے تخریبی اور انتشار انگیز سلوک سے تنگ آ کر اس نے خودکشی کر لی۔ اس کے یہ ساتھی بظاہر انقلاب پسند ہونے کے باوجود حقیقت میں ٹراٹسکی گروپ کے آلہ کار تھے۔ ان کی کوشش یہی تھی کہ جیسے بھی ہو زندگی کے ہر شعبے میں روسی انقلاب کو ناکام کیا جائے۔ چنانچہ مائیکافسکی کی وفات کے بعد جب تک وہ برسرِ اقتدار رہے۔ انہوں نے جدید روس کے اس عظیم اور تاریخ ساز عوام دوست شاعر کو قرادیت پسند قرار دے کر اس کی کتابوں کی اشاعت تک نہیں ہونے دی۔

پبلو نرودا کے بقول بلاشبہ مائیکافسکی کی طاقت۔ لطافت اور غضبناکی آج تک ہمارے دور کی شاعری میں بے مثال ہے۔

ایفل ٹاور

تو آؤ اے ٹاور ——— !

اگر چاہتے ہو بغاوت کے سردار بننا

تو آؤ اے ٹاور

کہ موزوں نہیں ہیں تمہارے لیئے یہ فضائیں

یہ پیرس ——— یہ قحباؤں، رجعت پسندی کے افسانہ خواں شاعروں کا گھروندہ

کہاں ہے تمہاری رہائش کے قابل

چلو اے بلند اور مضبوط ٹاور

ہماری طرب خیز گلیوں سے کیوں ڈر رہے ہو

ہمارے ٹریکٹر تمہاری حفاظت کرینگے

ہماری ملیں بھی یقیناً

رضامند ہوں گی تمہارے تحفّظ کی خاطر

یہ مانا وہاں تیر کے جانا آساں نہیں ہے

مگر جب ہمارے بہادر سپاہی

بہم مل کے بولیں گے پہلا ہی ہلّہ

فضا گونج اٹھے گی للکار بن کر

صفیں باندھ کر پُولے پیرس کی جنتا

بنے گی تمہارے لئے ایک پُل ——————

اور لوہے کی جلتی سلاخوں سے ہم داغ دینگے کلیجے سبھی غاصبوں کے

ہمارے ہاں آؤ

چلو ہاں چلو اس حسین ماسکو میں

دھوئیں میں جہاں مسکراتے ہیں فولاد پارے

وہاں پر تمہارا سبھی خیر مقدم کرینگے

ہر اک آدمی چاہے گا تم کو اپنے ہی کوچے میں رکھنا

ہر اک کی نگاہوں میں دیکھو گے تم پیار کے نور کی جگمگاہٹ

وہ ایک ایک دن میں کئی بار تم کو

سجائیں گے ——— لوہے سے تانبے سے تم پر ملمع کرینگے

تمہیں جگمگائیں گے سونے کے مانند

چلو چھوڑ دو پیرس کی اس سرزمیں کو

یہ پیرس ——— یہ آوارہ اوباش عیاشوں کا مسکن

اسے ڈوب جانے دو

بولون کے جنگلوں ——

اور عجائب گھروں ——

اور قبروں کی تاریکیوں ہیں

بڑھاؤ قدم اے بلند اور مضبوط ٹاور !

کرو فیصلہ کیونکہ چاروں طرف سے

بھڑکنے لگے ہیں بغاوت کے شعلے

فضا میں چٹخنے لرزنے لگی ہیں

پرانے سیہ پوش سپریں کی چولیں

گھن گرج

آنے والے دورِ زرّیں کے معزّز ساتھیو!

اے معزّز ساتھیو! اے وارثو!!

اس زمانے کی سیاہی آور یخ بستہ غلاظت کی تہوں کو چیر کر

مُردہ اور تاریک صدیوں سے مری دُنیا کا شاید جائزہ لیتے ہوئے

میرے یعنی مائیکافسکی کے بارے میں بھی تم پُوچھا کروگے کچھ سوال

اور تمہارے وقت کے اربابِ علم

اپنی پروازِ تصوّر اور کتابی علم سے
یہ بتائیں گے تمہیں
مائیکافسکی تھا اپنے دور کا وہ مطرب آتش نفس
جو گوارا کر نہ سکتا تھا جمودِ زندگی
اے پروفیسر ذرا
اپنی آنکھوں سے اتارو اپنا چشمہ تاکہ میں
اپنی اور اپنے زمانے کی کہوں خود کوئی بات
میں ہوں اِک ایسا بہشتی اور وارو غہ صفائی کا جسے
انقلابِ احمریں نے بخش رکھا ہے محاذِ شاعری
میں بھی تھا بیزار ہنگامی ادب سے دوستو
میں بھی گانا چاہتا تھا پیار کے رنگین گیت
میں نے لیکن اپنے نغموں کے گلے

گھونٹ ڈالا ہے گلا اُن دل نشیں نغمات کا

عام لوگوں کی طرح

مر گئے ہاں وہ مرے رنگین نغمے مر گئے

جیسے لاتعداد ساتھی مارے جاتے ہیں جہاد و جہد میں

ہاں سنو ——— !

اے آنے والے دورِ زرّیں کے معزّز ساتھیو

اے معزّز ساتھیو ! اے وارثو !!

اِک ڈھنڈورہ پیٹنے والے کی آوازِ بلند

اپنے نغموں میں مخاطب کر رہا ہوں مَیں تمہیں

جیسے ہو اِک زندہ انساں دُوسرے زندہ دل سے محوِ گفت گو

آنے والے دَور کے ایّام میں

مَیں تمہارے پاس پہنچوں گا ضرُور

اور میری شاعری

پھاند کر ادوار کی سب گھاٹیاں

شاعروں کے اور حکومت کے سروں سے سرسراتی اور لہراتی ہوئی

تم تک آئے گی ضرور

(شاید اپنی شان و شوکت اور سج دھج سے نہیں)

میرے نغمے اِک سپاہی کی جواں مردی کے ساتھ

بھاری بھر کم آہنی ملبوس زیبِ تن کئے

ایستادہ ہیں اجل کے خیر مقدم کے لئے

اپنے نغمے ——— اپنی پوری قوّت و عظمت کے ساتھ

(بیس سالوں تک رہے ہیں جو فضاؤں پر محیط)

مَیں تمہاری نذر کرتا ہوں بصد مہر و خلوص

آنے والے دورِ زرّیں کے اے مزدورو! معزّز ساتھیو !!



ماؤ سی تنگ

ماؤسی تنگ

ہمیں عوام کی خوشیوں ۔ ان کے جذبوں اور ان کے طور
طریقوں سے اپنے علم کے غرور میں نفرت نہیں کرنی چاہیئے
ہمیں ان کی زبان کو اپنانا اور ان کے مسائل کو ان کے
اپنے طریقوں سے شعر میں ڈھالنا چاہیئے۔ ہم عوام کا ایک
کبھی الگ نہ ہونے والا حصّہ ہیں۔ جب تک یہ خیال ہم
اپنے ذہن میں پوری طرح نہیں رچا لیتے اسوقت تک سچّا اور
انقلابی ادب پیدا نہیں کر سکتے۔

(ماؤسی تنگ)

ماؤ سی تنگ ۱۸۹۳ء میں ایک چینی کسان جین شینگ کے یہاں پیدا ہوا۔ ہوش سنبھالتے ہی گھر کے کام کاج میں ماں باپ کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔ آٹھ سال کا ہوا تو اسے گاؤں کے پرائمری سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ جہاں اس نے تیرہ سال کی عمر تک اپنی ابتدائی تعلیم مکمل کی۔ اس کے بعد باپ بیٹے کے سماجی اور معاشی نظریات کے اختلافات کی خلیج کچھ ایسی گہری ہو گئی کہ ماؤ کو سب سے پہلے اپنے گھر سے بغاوت کرنی پڑی۔ اور وہ ماں باپ کو چھوڑ کر تقریباً چھ ماہ تک اپنے ایک وکیل دوست شاؤ کے پاس ٹھہرا رہا۔ اسی دوران میں صوبہ ہونان کے پایۂ تخت چانگشا میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ماؤ کی زندگی پر بڑا گہرا اور پائدار اثر ڈالا۔ اور جس کے ردِ عمل کے طور پر وہ سیاسیات اور ملکی معاملات سے عملی دلچسپی لینے لگ گیا۔ اس کے بعد وہ ہسیانگ کے مدرسے میں داخل ہوا۔ جہاں اس نے طبعیات۔ تاریخ اور فلسفے کے علاوہ دیگر نئے مغربی علوم کا بھی مطالعہ کیا اور یہی مدرسہ اس کی ادبی زندگی کا سنگِ بنیاد ثابت ہوا۔

ماؤ نئے چین کا عوامی ہیرو ہونے کے ساتھ ساتھ بلاشبہ انقلابی قلم کار دل اور دانش ور دل کا ادبی رہنما بھی ہے۔ اپنی بے پناہ اور ان تھک سیاسی سرگرمیوں کے علاوہ وہ چینی ادبیات کا فاضل

ایک جادو بیان مقرر اور نہایت بلند مرتبت شاعر بھی ہے۔ اس کے اپنے بقول، اگرچہ اس کی نظمیں ماما ہو ہو (یعنی بے کار اور حماقت انگیز) ہیں اور وہ محض اس کے ذاتی دل بہلاوے کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی شعری لطافتوں اور فنی رعنائیوں میں ایک نئی دنیا جنم لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور چینی عوام کے شعور میں انقلابی ولولوں کی چنگاریاں بھڑکانے میں اس کی شاعری نے نہایت اہم، عظیم اور تاریخی رول ادا کیا ہے اور شاید اسی وجہ سے چینی عوام میں اس کے بارے میں یہ جملہ بہت مشہور ہے کہ

"ہمارے ایک شاعر نے سیاسی انقلاب کر ڈالا ——"

برف

ایک اِک ذرّے پہ ہے یخ بستگی چھائی ہوئی
دُھند میں لپٹا ہوا ہے پورے اتّر کا سماں
چین کی دیوار کے دونوں طرف سے پے بہ پے
گر رہی ہے برف جیسے ٹوٹتی ہیں پتّیاں
برف کے گالے ہی گالے اب نظر آتے ہیں
جیسے پیچھے رہ گیا ہے ایک شورِ بے کراں
زرد دریا کے بھی دونوں ساحلوں میں دُور تک
اب دکھائی دے نہیں سکتا کہیں آبِ رواں

خندہ زن ارضِ وطن ہے اس حسیں موسم میں یُوں
دودھیا جامے میں جیسے اک حسیں ہو گُل فشاں
دے رہی ہے ہر بہادر کو جو دعوت پیار کی
ان مناظر میں اِک ایسی جاذبیت ہے نہاں
کون کہتا ہے کہ تائی سونگ ہو انگ اور تائی سو
صاحبِ احساس تھے تہذیب کے تھے پاسباں
اور وہ چنگیز خاں بھی تھا تمدّن یافتہ
کھینچ سکتا تھا جو چیلوں پہ ہی صرف اپنی کماں
اُن پہ کھُل سکتے تھے کیونکر سینۂ فطرت کے راز
وُہ سمجھتے تھے کہاں حسن و مُحبّت کی زباں
آج ہی کے آدمی کے پاس یہ جذبات ہیں
آج ہی کا آدمی ہے زندگی کا راز داں

لال فوج

سفر دراز ہو تو ہو ہراس سے غرض نہیں
ہماری لال فوج کے جواں بھی تھک سکے کہیں
خوشی خوشی صعوبتوں کے وار جھیلتے ہوئے
یہ بڑھ رہے ہیں موت سے بھی پھاگ کھیلتے ہوئے
لپک رہے ہیں سربلند چوٹیاں پھلانگ کر
گزر رہے ہیں تند و تیز ندّیوں سے بے خطر

نشیب اور فراز یہ سیانگ کے پہاڑ کے
ملبینگ کے قریب سبزہ زار یہ گھنے گھنے

یہ گولڈ سینڈ ندی جس کی موج موج کوہ کن
غضب کا جس میں جوش ہے بلا کا جس میں بانکپن

یہ تاؤ ندی کی ہوا جو منجمد کرے لہو
یہ شامن پہاڑ جس پہ برف ہے چہار سو

مصیبتوں کے یہ کڑے مقام جب گزر گئے
جواں ہمارے جب بھی یہ حصار پار کر گئے

لبوں پہ مستیٔ طرب بہار بن کے چھائے گی
قدم قدم پہ لال فوج جھوم جھوم جائے گی



نذرالاسلام

نذرالسلام

اے افلاس! تو نے ہی مجھے یہ عظمت بخشی ہے۔ عیسےٰ کے
سر پر کانٹوں کا تاج کتنا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ مرحبا کہ اس
زینت سے تو نے مجھے بھی سرفراز کیا اور وہ جوانمردی عطا
کی جو نورِ حقیقی کی پردہ ہے۔ میری نگاہوں کو تو نے آتش
فگن اور زبان کو تند خو بنایا اور یہ تیری ہی تربیت کا اثر
ہے کہ میرا نغمہ اپنی تلواروں سے زیادہ تیکھا ہے۔
(نذرالسلام)

"قاضی نذر الاسلام ہندوستان کا وہ پہلا باشعور اور مجاہد ادیب ہے جس کی شعری قوتوں نے ہمیشہ انسان کی ذہنی اور جسمانی آزادی کے لئے سرکشی اور بغاوت کا نعرۂ مستانہ بلند کیا ہے۔

مغربی بنگال میں ضلع بردوان کا ایک چھوٹا سا گاؤں چوریلیا اس آتش بیان باغی اور انقلابی شاعر کی جنم بھومی ہے۔ ۱۸۹۷ء میں اس نے ایک انتہائی قلاش مسلمان گھرانے میں آنکھ کھولی اور پیدائش کے چند سال بعد ہی وہ یتیم ہو گیا۔ اس کے بعد اس کی چچی کے کمزور کندھوں نے اس کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا بوجھ برداشت کیا۔ چچی کے ایثار اور اس کی بے پناہ شفقت کا ذکر نذر الاسلام نے اپنی اکثر تخلیقات میں کیا ہے۔

بے انتہا فلاکت اور فاقہ کشی کے باوجود اس نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی اور مقامی زبانوں کے علاوہ فارسی اور انگریزی سے نہ صرف واقفیت حاصل کی بلکہ ان دونوں زبانوں کے ادب کا گہرا مطالعہ بھی کیا۔

عہدِ طفولیت ہی سے اسے دیہاتی گیت لکھنے کا شوق تھا اور ۱۹۱۵ء میں جب وہ فوج میں بھرتی ہو کر بصرہ چلا گیا تو یہ شوق غیر معمولی طور پر تیز ہو گیا اور اس نے سنجیدگی سے

شعر و شاعری کی طرف توجہ شروع کر دی۔ دوسرے لفظوں میں تیغ و سناں کی جھنکاروں نے اس کی شاعری کو پروان چڑھایا۔ اس کے نغموں کے خروش اور گھن گرج کی شاید یہی وجہ ہے کہ ان کو میدانِ جنگ کی تند و تیز فضاؤں نے پالا ہے لیکن اس کی آتشیں اور انقلاب انگیز نظموں کی وجہ سے اسے بعد میں فوجی اعزاز و پنشن سے بھی محروم کر دیا گیا۔ کیونکہ ان نظموں میں اس نے حکومت کو بھی اپنی کڑی تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔

لیکن نذر السلام اسکے بعد بھی کسانوں اور مزدوروں کے دلوں میں حکومت اور عوام دشمن برسرِ اقتدار طبقے کے خلاف نفرت اور بغاوت کی چنگاریاں پھونکتا رہا اور اسی جرم میں نہ صرف اس کی نظموں کے پانچ مجموعے ضبط ہوئے بلکہ اسے دو بار جیل میں بھی جانا پڑا۔

شاعری کے علاوہ اسے راگ و دیا پر بھی عبور حاصل ہے اور اس نے ڈراموں۔ کہانیوں اور مضامین کے اکثر مجموعے بھی تصنیف کئے ہیں۔ جن میں اگنی بینا۔ باندھن ہارا۔ مرتو کھدا۔ بتھار دھان۔ نثر لو ہارا اور شیتیا خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

سنہ ۱۹۴۲ء سے نذر السلام فالج کا مریض ہے۔ صاحبِ فراش ہے اور نہایت کس مپرسی کی زندگی بسر کر رہا ہے لیکن اس کے باوجود اپنے نظریات پر بدستور سختی اور استحکام سے قائم ہے۔

ہم کون ہیں ؟

دل ہمارے صاف ہیں بُغض و حسد سے پاک ہیں
خالقِ ارض و سما کی طرح ہم بے باک ہیں
تیز و طوفانی ہواؤں کی طرح ہیں بے قرار
تُند خو جیسے تلاطم۔ شوخ جیسے آبشار
ہم ہیں آزادی کے پنچھی دم بدم اور صف بہ صف
مائلِ پرواز ہیں جو آسمانوں کی طرف

ہم حسیں ہیں اور فطرت سے بھی بڑھ کر ہیں حسیں
چومتی ہے اپنی عظمت آسمانوں کی جبیں
پیتے ہیں بارش کا پانی کھاتے ہیں جنگل کے پھل
اپنی ہر مسکان میں کھلتے ہیں نغموں کے کنول
ہم ہیں سرشار و خراماں بادلوں کی بارشیں
روزِ پیدائش سے آزادی ہے جزوِ جاں ہمیں
ہم نہیں رکھتے قوانینِ شہی سے آگہی
جان دیں گے ہم نہ احکام و اطاعت پہ کبھی
بے کلی ہے دل کے بے پایاں سمندر میں مدام
ہے تگ و دو رات دن جہد و عمل ہے صبح و شام
ہم ہیں آزادی کی ندی کا وہ پانی دوستو!
رک نہیں سکتی کبھی جس کی روانی دوستو!

فریاد

جو سینچتے ہیں اپنے لہُو سے یہ سبز کھیت
فاقوں سے ہیں نڈھال وُہ بدبخت صبح و شام
وہ لوگ ہیں زمین کی قسمت کے پاسباں
مٹّی پہ بیٹھنا بھی ہے جن کے لئے حرام
اندھے ہیں زندگی کے نگہباں بنے ہُوئے
بہروں نے تھام رکھی ہے قانون کی لگام

کیا عدل و راستی کی توقع کہ اصل میں
قصاب ہے اِک ایسا یہ بیداد گر نظام
جو گھونپتا ہے ہاتھ سے حلقوم میں چھرا
لیتا ہے لیکن اپنی زباں سے خدا کا نام

پھر بھی میں سن رہا ہوں اسی تیرہ رات میں
اِک صبحِ نو بہ نو کا دمکتا ہوا پیام
سوکھے ہوئے لبوں سے وہ نغماتِ آتشیں
جن کی ہر ایک تان میں ہے زہرِ انتقام
صدیوں سے جو کٹیں نہ غلامی کی بیڑیاں
گاتی ہیں ٹوٹ ٹوٹ کے اب وہ بہر مقام
تابندہ باد روشنیٔ صبحِ انقلاب
پائندہ باد بڑھتے ابھرتے ہوئے عوام

گجر

چھائی جاتی ہے آسمانوں پر
کسی ڈنکے کی چوٹ کی گونجار
اور اب تک ہمارے پاؤں تلے
سطحِ ارض جہاں نہیں ہموار
پھر بھی اے صبحِ نو کے فرزندو!
ہم نہیں ہو سکیں گے کم رفتار

خواہ حائل ہو اپنے رستے میں
بندھیاچل سا کوہِ عزم شکن
اپنے جہد و عمل کی قوّت سے
پھاڑ کر رات کا سیاہ کفن
کھٹکھٹا کر شفق کا دروازہ
ہم نکالیں گے صبحِ نو کی دُلہن

ہم نئی زندگی کے مطرب ہیں
ولولے زمزموں میں ڈھالیں گے
اپنے سازِ طرب کی تانوں سے
تیرہ ماحول کو اُجالیں گے
مُردہ جسموں فسردہ نبضوں میں

رُوح پھونکیں گے جان ڈالیں گے

وہ سُنو موت کے حصاروں سے
زیست آواز دے رہی ہے ہمیں
توڑ کر ہر طرح کی زنجیریں
ساتھیو آؤ مِل کے بڑھتے چلیں

پیش رفتار رہرو

بڑھو آگے اے تازہ دم رہرو!
کہ آگے ہی بڑھنا ہے اپنا کمال
بڑھو لیس ہو ہو کے ہتھیاروں سے
کہاں ہے ہتھوڑا کدھر ہے کدال
بڑھو کیونکہ یہ وقت ہے کُوچ کا
بڑھو کیونکہ خود وقت ہے تیز رو

بڑھو کیونکہ ظلمات حالات میں
ہمیں جگمگاتے دیئے کی ہیں لو
وہ ہو مصر یا چین یا آئرلینڈ
عرب۔ کوریا۔ ناروے ہو کہ رُوس
ہمارے لہُو سے ہی اب جا بہ جا
نکلتے ہیں دُنیائے نو کے جلوس
ہمارا ہے غم ایک ہی اور ہمیں
یہ لمحاتی راحت نہیں چاہیئے
ہمیں شیریں خوابوں سے کیا واسطہ
ہمیں سستی شہرت نہیں چاہیئے
یہ قالین و مخمل۔ یہ عیش و نشاط
کہاں ہیں مداوائے رنج و ملال

کہ یہ سب تعفّن زدہ دولتیں
ہیں بدکار سرمایہ داری کے جال
بڑھو آگے اے تازہ دم رہرو
کہ آگے ہی بڑھنا ہے اپنا کمال
نئی صبح کا کیف انگیز راگ
سُنو تُم بھی سُنتا ہُوں میں آج جو
بڑھو۔ اَور تیّار ہو کر بڑھو
بنو اپنے حق کے تو قابض بنو
بڑھو آگے اے تازہ دم رہرو
بڑھو آگے اے تازہ دم رہرو



پبلو نرودا

پبلو نرودا

مَیں ایک ایسا ادیب تھا جو سنسان راتوں میں دیوار
کو توڑ کر نکل جانا چاہتا تھا۔ اب میں خوش ہوں۔ ہمیں
سڑک کے بیچوں بیچ زندگی کی جانب چلنا چاہیے۔ وہ
ادیب جو سیاست سے الگ رہتا ہے ایک فرضی شے
ہے جسے سرمایہ دار نے گھڑا اور پروان چڑھایا ہے۔

(نرودا)

چلّی (جنوبی امریکہ) کے عوام کا محبوب ترین اور دُنیا بھر کا عظیم انقلابی شاعر پبلو نرودا جذباتی یا، نشاتی، اعتبار ہی سے نہیں عملی طور پر بھی اپنے ذہن و دماغ کی تمام تر صلاحیتوں کا ناطہ عوام سے جوڑ چکا ہے۔ اور اسی جرم کی پاداش میں وہ مجلسِ قانون ساز کا ایک اہم رکن ہونے کے باوجود جلاوطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔

وہ تے موکو ایک چھوٹے سے قصبہ میں سنہ ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوا۔ اور سنہ ۱۹۲۱ء میں پہلی بار اس کی منظومات کا ایک مختصر سا مجموعہ منظرِ عام پر آیا۔ لیکن پبلو نرودا کی جس شعری تصنیف نے یورپ کے تقریباً تمام بڑے بڑے نقادوں کو چونکا دیا۔ وہ سنہ ۱۹۲۴ء میں "محبت کی بیس نظمیں اور ایک گیت یاس کا" کے نام سے شائع ہوئی۔ یہ مجموعہ لاطینی امریکہ کی شاعری میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور سنہ ۱۹۳۶ء میں جب پبلو نرودا میڈرڈ میں چلّی کے قونصل کے عہدے پر معمور تھا اس وقت اس کے آتشیں نغموں کی گونج امریکہ اور یورپ میں پھیل کر ساری دُنیا کے باشعور ذہنوں تک پہنچ چکی تھی اور اب تو متعدد متمدن زبانوں میں اس کی تصانیف کے ترجمے بھی ہو چکے ہیں، اور دُوسری عالمی امن کانگرس وارسا نے اسے اس کی نظموں پر ادب کا بین الاقوامی

انعام بھی پیش کیا ہے

نئی نئی پُر اثر تشبیہات۔ تر و تازہ اور شاداب استعارے۔ روائتی اور رسمی قیود سے دست برداری اور اندازِ بیاں کی لطافت اور بے پناہ خلوص پیبلو نرودا کی شاعری کی اہم ترین خصوصیات ہیں۔ لوئی اراگاں کہتا ہے کہ جب میں نے پیبلو نرودا کے گیت کے طوفانی مد و جزر کی آواز سنی۔ تو مَیں مارچ کرتے ہوئے سپاہیوں کے بھاری قدموں پر یقین نہ کر سکا۔

پیبلو نرودا کو ایک کامیاب اور عظیم فنکار بنانے میں جن دو شاعروں نے نہایت اہم اور غیر معمولی رول ادا کیا ہے۔ ان میں ایک روس کا انقلابی اور عوامی شاعر "مائیکافسکی" ہے اور دوسرا مشہور امریکی مصنف "والٹ وہٹ مین"۔ حالانکہ ان دونوں شاعروں کے ادبی اور فنی نظریات اور سماجی ماحول میں کوئی مناسبت نہیں۔ تاہم پیبلو نرودا جہاں مائیکافسکی کے نغموں کے خروش اور گھن گرج اور اس کے کلام کی مقصدیت اور افادیت کی تقلید کرتا ہے وہاں وہٹ مین کے خلوص اور اس کے سوز و درد میں ڈوبے ہوئے اندازِ بیاں کی گہرائی سے بھی بہت متاثر ہے۔

وضاحت

آپ پُوچھیں گے کہ نرگس کے بنفشے کے ہیں وہ پھُول کدھر
لالہ زار اب وہ کہاں ہو گئے غائب جن میں
لیا کرتا تھا دلِ نکہت وحسن انگڑائی
جن کے پھولوں کی طراوت نے ہمیشہ بخشی
ذہن اور رُوح کو بالیدگی و زیبائی
آپ پُوچھیں گے کہ بارش کے کہاں ہیں وہ ضیا پاش گہر
جن سے وُہ نغمئی الفاظ ٹپکتے تھے کہ جو
شیشۂ ذہن میں صہبائے طرب بھرتے تھے

جن میں ملتی تھیں پرندوں کی رسیلی تانیں
جو حسیں لمحوں سے معمور ہُوا کرتے تھے

آپ پُوچھیں گے کہ مسکن ہے مرا کیا یہی ویران کھنڈر
اس میں آتی تھی کبھی گیندے کے پھُولوں کی مہک

یہ کبھی حسن و محبّت کا پری خانہ تھا
قہقہے بچّوں کے کتّوں کی چھلانگیں تھیں یہاں

میرا گھر فرحت و تسکین کا کاشانہ تھا
اُف وہ جلّاد جو آئے تھے مراکش کے لٹیرے لے کر

گھونپ کر کھیلتے بچّوں کے کلیجے میں چھُرے
جو یہاں اپنی شجاعت کا مزا لیتے تھے

ساتھ جن کے تھے وہ ظالم وہ کمینے راہب
جو ہر اک جابر و قاتل کو دُعا دیتے تھے

اسٹالن گراڈ

(۱)

مَیں نے لکھّا ہے بہت
وقت اور نیلے سمندر کی گھنی امواج پر
میرا موضوعِ سخن اب تک رہے
آسماں کی وسعتیں
شاداب سیبوں کے درخت

میں نے گائے ہیں گلابی عارضوں کے آنسوؤں کے راگ بھی

اب ترے بارے میں لکھتا ہوں اے اسٹالن گراڈ !

تیرے نورانی دھوئیں میں ناچتا ہے میرا دل

میں گزر آیا ہوں حسن و عشق کے رنگیں دھندلکے چیر کر

اب میں چھوتا ہوں حیات نو کی صبح کی تابانیاں

جو ہوئیں پیدا ترے خورشید سے اے پیارے اسٹالن گراڈ !

اب میں ہوں آزاد میری روح بھی آزاد ہے

اب نہیں میری غذا

مضمحل کاغذ کے ٹکڑے

جو سپاہی کے لہو دھبوں سے ملوث جابجا

اب میں اک بربط ہوں تیرے گیت گانے کے لئے

اب مرے نغمے ہیں تیرے سرفروشوں کے نقیب

سرفروش ——— ؟

تیری دیواروں سے جو کچلے گئے

جن کو مرتا دیکھ کر

اک جرس کی طرح گونج اٹھی مرے نغموں کی لے

(۲)

اور امریکی سپاہی بھی ہیں اب تیرے رفیق

مارتے ہیں تیری خاطر اب جو صحراؤں میں سانپ

سانپ جو زہری بھی ہیں کالے بھی ہیں گورے بھی ہیں

اب نہیں ہے تو اکیلا اے مرے محبوب اسٹالن گراڈ!

اور وہ انگلینڈ کے جواں باز شیر

جو سمندر کی تلاطم خیز موجیں پھاند کر

گاڑتے ہیں اپنے پنجوں کو زمیں کی روح میں

وُہ بھی تیرے ساتھ ہیں

اب نہیں ہے تو اکیلا اے مرے محبوب اسٹالن گراڈ !

اور فرانسیسی عوام

اپنے غصّے کے عَلَم کھولے ہُوئے

لَوٹ آئے ہیں تری عظمت کے گُن گاتے ہُوئے

تیرے بدخواہوں کی یلغاروں سے ٹکراتے ہُوئے

اب نہیں ہے تو اکیلا اے مرے محبُوب اسٹالن گراڈ !

اب ترے اُونچے پہاڑوں کے تلے

کون کہتا ہے کہ تیرے نوجواں مدفون ہیں

یہ تو وُہ جانباز ہیں جو زندۂ جاوید ہیں

چُومتی ہیں جن کی نظریں آج بھی تیری جبیں

آج وہ سب ہاتھ ہیں ٹوٹے ہوئے
نوچ لینا چاہتے تھے جو تجھے
آج وہ آنکھیں بھی ہیں پھُکی ہوئی
شیطنت جن میں دہکتی تھی شراروں کی طرح
بُوٹ بھی وہ آج خوں آلودہ ہیں
روند دینا چاہتے تھے جو تجھے
قابلِ تعظیم ہے تیرا یہ نیلا آسماں
تیرے سر پہ ہے حسیں تاروں کا تاج
تُو ہے نصرت اور محنت کا حصار
خوں میں بھیگا ہوا ہے تیرا یہ نیلا افق
اور اسٹالن کی آنکھیں دیکھتی ہیں اس طرف

کیونکہ یہ اس کا خود اپنا خون ہے

تیرے بچّے۔ تیرے باغی اور تیرے سرفروش
تیری دھرتی کا ہیں جوبن اور تیرا حسن ہیں
تیری دنیا زندگی اور موت کا اک رقص ہے
تو تھکے جسموں کے حق میں ایک روحِ تازہ ہے
تو دلوں کی آس ہے اے پیارے اسٹالن گراڈ!
(آس کھل جاتی ہے جو باغوں کے پھولوں کی طرح
اور ظالم رائفلوں سے روند دیتے ہیں جنہیں)
تیرے اونچے آسماں کے لختِ دل ہیں تیرے مینارِ بلند
تیرے آئندہ زمانے کے محافظ ہیں یہی

(۴)

وہ جو تھے بدخواہ اور دشمن ترے

ہو چکے ہیں پائمال و زیرِ خاک

جو اڑاتے تھے ہنسی یونان کی تقدیس کی

تھوکتے تھے اس کے علم و فن کے رخساروں پہ جو

اب کہاں ہیں وہ اے اسٹالن گراڈ

وہ بنا ڈالا جنہوں نے اک کھنڈر اسپین کو

سڑ رہے ہیں آج تیرے پاؤں میں

وہ جنہوں نے کر دیا ہالینڈ کے دریاؤں اور پھولوں کو ——

انساں کے لہو سے داغ داغ

اپنے کوڑوں اور اپنی تیز تلواروں کے ساتھ

سو رہے ہیں آج تیری خاک میں

وہ جنہوں نے بھیڑیوں کی طرح غراتے ہوئے

اک حسیں اور جگمگاتی رات میں

تاروں کی سب بہاریں پھونک دیں

آج وہ خاموش اور بے رُوح ہیں

(۵)

اے میرے محبوب استالن گراڈ !

تیرے گائے جانے والے اور جو گائے گئے ہیں ان ترانوں کو سلام

تیرے سرفروش جوانوں شہیدوں باغیوں اور جاں نثاروں کو سلام

تیرے نیلے آسماں اور چاند تاروں کو سلام

تیرے خورشیدِ درخشاں کی شعاعوں کو سلام

تجھ کو اور تیری ہواؤں کو سلام

تیرے بچوں، تیرے پوتوں تیری ماؤں کو سلام

آرزو

مَیں ہر آدمی کے لئے چاہتا ہُوں

زمیں۔ آگ۔ روٹی۔ گیہوں اور چینی

سمندر۔ کتابیں

یہی میری خواہش ہے وہ جُرم لوگو

میں پاداش میں جس کی اب دربدر پھر رہا ہُوں

مری جستجو میں ہیں غدّار سرکار کے سب کرائے کے منصف

میرا نام جو جا بجا وہ

سدھائے ہوئے بندروں کی طرح گھومتے ہیں

کوئی دن تھا میں خود بھی تھا اُن کا ساتھی

وہ بھولی ہوئی صبح کا ایک زارِ درخشاں

وہ اِک کان دروازے پر جس کے میں بھی تو تھا ساتھ ان کے

مگر میں نے دیکھا

وہاں —— جس گھڑی اپنے آفت زدہ بھائیوں کو

تو بے ساختہ چیخ اُٹھا

"بہت دیر تک اب نہ بہنو گے تم چیتھڑے میرے لوگو!

بہت دیر تک بھوکے پیاسے نہیں رہ سکو گے

اُٹھو گے بہت جلد تم بن کے فرزند اپنے وطن کے

بنو گے تمہیں آخر کار ان جنگلوں کے مقدّس خزانوں کے مالک

تمہارا بھی حصّہ ہے دُنیا کی رعنائیوں۔ راحتوں اور رنگینیوں میں

اور اب عورتیں اپنے بچّوں کی خاطر

نہ آنسو بہانے پہ مجبور ہوں گی ـــــــــ"

مگر ظلمتِ شب میں میری یہ آواز سُن کر

حکومت کے فرزند جھلّا اُٹھے تھے

وہ محنت کشوں کو کوئی حصّہ دینا نہیں چاہتے تھے

وُہ کرنے لگے میری اس آرزو کی مذمت

مگر پھر بھی مجھ کو یہ کامل یقیں تھا

مجھے بھی بہت جلد طاقت ملے گی

اسی واسطے چھوڑ کر میں نے ان نیم جاں اور بے رُوح کٹھ پتلیوں کو

دیا ساتھ لوگوں کا ——— محنت کشوں کا

مَیں اپنے وطن کو
وطن کے فلاکت زدہ ساتھیوں کے لئے چاہتا ہوں
اسی روزِ روشن کی خواہش ہے مجھ کو
وطن کی ہر اک راہ پر جو اُجالے بکھیرے
مجھے چاہیئے روشنی اور ہل کی محبت
مری آرزو ہے کہ میں وہ لکیریں مٹا دوں
اُنہوں نے جو نفرت سے کھینچی ہیں ———
——— لوگوں کو روٹی سے محروم کرنے کی خاطر



لوئی اراگاں

لوئی اراگاؤں

جب میں سانس لیتا ہوں تو بعض لوگوں کو جینا دو بھر ہو جاتا ہے۔ میں ان کی نیند میں نہ جانے کون سی محرومی پیدا کر دیتا ہوں۔ میں جب مصرعے موزوں کرتا ہوں تو ایسا محسوس کرتا ہوں جیسے ڈھول پٹنے لگے ہوں، اور اتنا شور ہوتا ہے جس سے مُردے بھی جاگ اٹھیں۔

(لوئی اراگاؤں)

موجودہ فرانس کا عظیم مفکّر ادیب لوئی اراگاؤں ——— ایک مقبول و محبوب عوامی شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک زبردست عملی کارکن بھی ہے۔

اراگاؤں کی شاعری نے فرانس کے انحطاط پذیر اور عیش پرستانہ ماحول میں جنم لیا تھا۔ اس نے ۱۹۱۹ء میں لکھنا شروع کیا اور پورے دس سال تک اس کی ذہنی اور تخلیقی صلاحتیں تحت الشعور کی بھول بھلیوں اور بے مقصد جدّت کی اندھیاریوں میں ٹامک ٹوئیے مارتی رہیں اور اس کا آرٹ سلوریلزم ایسی زوال پسند تحریک کی نمائندگی کرتا رہا۔

لیکن ۱۹۳۰ء میں عوامی تحریکوں کے بڑھتے چڑھتے ہوئے دھارے سے متاثر ہوکر اُس نے اپنے فکر و خیال کی ناپختگی اور اپنے ادبی میلانات کی بے راہ روی کو شدت سے محسوس کیا اور اسی زمانے میں اس نے اپنے ذہن اور عمل کا رشتہ اشتراکیت سے جوڑ لیا اور ۱۹۳۳ء میں جب اس نے سوویت روس کا دورہ کیا تو وہاں مایکافسکی کی رفاقت اور اس کی شاعری کی شدّت اور غضب ناکی نے اس کے ادبی نظریات کو سنوارنے اور نکھارنے میں بڑا سہارا دیا۔ اور اس کی فنی قوّتوں کی شریانوں میں جیسے مایکافسکی کی شخصیت اور شاعری کے گہرے اثرات نے نئی

زندگی اور توانائی کا خون دوڑا دیا۔

اراگاؤں کی زندگی کا وہ دور غیر معمولی طور پر اہمیت رکھتا ہے۔ جب دوسری جنگِ عظیم میں نازیوں نے فرانس پر حملہ کرنے کے بعد فاشزم کی مکروہ بنیادوں پر وہاں اپنی حکومت قائم کر لی تھی اور اس وقت بھی اراگاؤں اپنی نظموں اور کہانیوں کے پردوں پر نازیوں کے جبر و تشدد کے نقوش اجاگر کرتا رہا تھا۔ اور فرانسیسی انقلابی نوجوانوں نے نازیوں کے خلاف ان کا مقابلہ کرنے کے لئے جو تحریک چلائی تھی اراگاؤں کئی سال تک روپوش رہ کر اس تحریک کے ہراول دستے کے ایک رکن کی حیثیت سے اُسے آگے بڑھاتا رہا تھا۔

اراگاؤں جدید فرانس کا وہ مجاہد شاعر ہے۔ جس نے گذشتہ سو سال کی بیمار اور یاسیت انگیز ادبی روایات کو جھٹلا کر فرانسیسی شاعری میں عمل اور بیداری کی روح پھونکی اور اسے ارتقاء اور انقلاب کے راستے پر گامزن کیا ہے۔ یورپ کے وہ نقاد بھی جو اراگاؤں کے سیاسی اور معاشی نظریوں سے متفق نہیں ہیں اس کی شاعرانہ بصیرت اور فنی عظمت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں۔

ترقی پسندی

اندھیری رات کا احساس تھا اگرچہ مجھے

مگر یہ علم نہ تھا میرے خون کے چھینٹے

جلا بھی سکتے ہیں امید و آرزو کے چراغ

خبر نہ تھی کہ مرے دل کے بیکراں جذبے

بجھر کے توڑ بھی سکتے ہیں ظلمتوں کے ایاغ

مرے شعور کے پھیلے ہوئے دھندلکوں میں
ترے کرم سے کھلے ہیں بصیرتوں کے کنول
تجھی سے تازہ ہوئیں میرے ذہن کی یادیں
تجھی نے بخشا مری زندگی کو سوزِ عمل

ترے ہی فیض سے میری حیات کی تلخی
جہاد اور بغاوت کی آگ میں جل کر
اُبل رہی ہے مرے گرم گرم گیتوں میں
نشاط اور محبّت کے رُوپ میں ڈھل کر

میں اپنے دیس کے پرچم کو ہاتھ میں لے کر
تری ہی رفعت و عظمت کے گیت گاتا ہُوں

تری چمک سے تری لال کرنوں سے
سیاہ رنگ دماغوں کو جگمگاتا ہوں

ہزار بار ترا شکریہ کہ تو نے مجھے
وفا کا درس دیا زیست کا وقار دیا
بھرا وہ رنگ عمل جس کی تاب نا کی نے
مرے کمال کے ہر نقش کو نکھار دیا

پیرس

غلیظ بارود کے دھوئیں میں

گھناونی موت لاکھ طوفان اٹھا کے لاتی رہی ہے اکثر
مگر یہ وہ سرزمیں ہے جس کا جوان سینہ کبھی نہ دھڑکا
جہاں ہواؤں کے مست جھونکے شراب چھلکا رہے ہیں اب بھی
جہاں جھلکتی ہیں اُجلی صبحیں اُداس راتوں کی تیرگی میں
جہاں شکستوں میں بھی چھپی ہے نئے زمانے کی فتح یابی

جہاں کئی آہنی ارادے مچل رہے ہیں تباہیوں میں
جہاں کے بیباک باغیوں سے عظیم تر کوئی شے نہیں ہے
وہ سربلند اور عظیم باغی کہ جن کی للکار گونجتی ہے
جہاں کے مرجھائے گل کدوں میں جہاں کے ویران بام و در میں
انہیں کی للکار کی لپک ہے جو چیر کر فاشیت کا سینہ
قدم قدم پر سنا رہی ہے حسین آزادیوں کا مژدہ

فن

تم نے مجھ سے یہ کہا تھا جانِ من!
"تم ابھی اک خاص مدت کے لئے
جن کی موسیقی بہت پُر شور ہے
سرد کر دو آپ ایسے نغموں کے دیئے

آج تو وہ دور ہے جس میں عوام
ہاؤ و ہو کی تاب لا سکتے نہیں

وُہ تمنائی ہیں سہل الفاظ کے
وہ لُغت میں سر کھپا سکتے نہیں

اُن کو ایسے زمزمے درکار ہیں
جن کے وُہ سائے تلے سستا سکیں
اور جب ہوں سوچ میں ڈوبے ہُوئے
دِھیرے دِھیرے وُہ انھیں دُہرا سکیں"

جانتا ہُوں تم کو مجھ سے پیار ہے
بارہا پھر بھی یہی تُم نے کہا
"واقعی یہ چاہتے ہو تُم اگر
دم بھروں میں بھی تمہارے پیار کا

تو پھر اپنی شاعری کی رُوح میں
تُم مری تصویر ایسے کھینچ دو
جیسے جیتا جاگتا پیڑا کوئی
جاگزیں سُورج مُکھی کے دل میں ہو

اور ہر موضُوع کی گہرائی میں
اور اِک موضُوع بھی ہو جلوہ بار
اور کرو خُورشیدِ نو کے نُور کو
مہر و اُلفت کی دُلہن سے ہم کنار"



ناظم حکمت

ناظم حکمت

بعض اوقات مَیں بھی آہیں بھر سکتا ہُوں۔ میں بھی سنہرے بادلوں سے پروتے ہوئے لعلوں کے ہار بنا سکتا ہُوں۔ لیکن وُہ پری جو میرے شاعرانہ فیضان کا سرچشمہ ہے اس کے شانوں پہ فولاد کے پر ہیں۔

(ناظم حکمت)

ترکی کا "گاندل" ناظم حکمت اپنے وطن ہی کا نہیں پوری انسانیت کا عظیم اور تاریخ ساز انقلابی شاعر ہے۔ ۱۹۰۲ء میں اس نے ترکی کے ایک تعلیم یافتہ خاندان میں جنم لیا۔ اس کا دادا فارسی زبان کا فاضل اور اپنے وقت کا مشہور موسیقار تھا۔ چنانچہ فارسی زبان اور علمِ موسیقی سے ناظم کا لگاؤ اپنے دادا کا مرہونِ منت ہے۔ اس کی والدہ ایک اعلیٰ پایہ کی مصورہ تھی۔ ناظم کی شاعرانہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں اس کی والدہ کا بہت ہاتھ ہے۔

تیرہ سال کی عمر میں ناظم نے شاعری شروع کر دی اور سولہ سال کی عمر میں پہلی دفعہ اس کا کلام منظرِ عام پر آیا۔ ۱۹۲۱ء میں انیس سال کی عمر میں اس نے قومی تحریک میں مصطفےٰ کمال کو اپنی خدمات پیش کر دیں اور اناطولیہ کے ایک چھوٹے سے شہر میں اسے معلمی کے عہدے پر معمور کر دیا گیا۔ اناطولیہ میں اسے ترکی کسانوں، مزدوروں اور فوجیوں کی زندگی کو انتہائی قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقعہ ملا۔ اور اس کی شاعری بھی اس ماحول سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوئی۔ اسی دوران میں انقرہ میں ایک مارکسسٹ گروپ سے اس کی راہ و رسم پیدا

ہوتی ۔ جس کے توسط سے وہ سوویٹ یونین چلا گیا۔ وہاں ماسکو یونیورسٹی میں اس نے فلسفے ۔ عمرانیات ، اور اقتصادیات کا گہرا مطالعہ کیا۔ ۱۹۲۵ء میں جب وہ واپس آیا تو ترکی کی سامراج دوست حکومت نے اسے تین سال کے لئے قید کر دیا ۔

اور ۱۹۳۵ء میں جب پیرس میں آرٹ دشمن اور کلچر شکن فاشیوں کے خلاف دُنیا بھر کے نمائندہ ادیبوں کا بین الاقوامی اجتماع ہوا ۔ تو اس میں ترکی کے ادیبوں کی طرف سے ناظم نے بھی شمولیت کی اور اس کے فوراً بعد ترکی حکومت نے اسے اس جُرم میں اٹھائیس سال کے لئے گرفتار کر لیا کہ حکومت کو اس کی ایسی نظمیں ترک نیوی کے جہاز رانوں اور فوجی ایکڈمی کے طالب علموں سے برآمد ہوتی ہیں جو اشتراکیت کا پرچار کرتی ہیں ۔

اس قید کے دوران میں ناظم پر بہت تشدد کیا گیا اور وہ دل کی ایک خوفناک بیماری میں مبتلا ہو گیا اور پھر جب دُنیا بھر کے باشعور عوام میں اس تشدد کے خلاف غصے اور نفرت کا اظہار کیا گیا ، اور حکومت کے اس فاشی طرز عمل پر بھرپور صدائے احتجاج بلند کی گئی ۔ تو جولائی ۱۹۵۰ء میں ترکی حکومت ناظم کو رہا کرنے پر مجبور ہو گئی ۔

ناظم روسی شاعر مایئکافسکی سے بے حد متاثر ہے اور لوئی اراگاں کے الفاظ میں بے شک وہ خود بھی ترکی کا مایئکافسکی ہے ۔ کیونکہ اس کی اپنی شاعری میں بھی وہی خروش ۔ عظمت اور بے باکی ہے ۔ جو مایئکافسکی کا طرۂ امتیاز ہے ۔

مَوت

کیا نہیں بیٹھو گے تم اَے میرے پیارے دوستو
مَیں خلوصِ دِل سے کہتا ہُوں تمہیں خوش آمدید

جانتا ہُوں جب مَیں تھا سویا ہُوا
خواب کی دُنیا میں تھا کھویا ہُوا

جیل کی اس سرد و تیرہ کوٹھڑی میں بے خطر
آ گئے تم سامنے والی وہ کھڑکی پھاند کر

جانتا ہوں تم نے وہ شیشی دوا والی اُٹھائی تک نہیں
ارغوانی گولیوں والی وہ ڈبیا بھی ہلائی تک نہیں
اپنے ہاتھوں میں لئے اِک دُوسرے کے ہاتھ کو
آ گئے تم میرے بستر کے سرہانے دوستو
ہے تمہارے سب کے چہروں پر ستاروں کی چمک
لالہ زاروں کا تبسم۔ ماہ پاروں کی چمک
کیا نہیں بیٹھو گے تم اے میرے پیارے دوستو
میں خلوصِ دِل سے کہتا ہوں تمہیں خوش آمدید
کیا یہ کم دِلچسپ ہے اے ساتھیو
مَیں سمجھتا تھا کہ تم مرحُوم ہو
چُونکہ جنّت اور جہنّم پر نہیں میرا یقیں
اور خدا سے بھی مری کوئی شناسائی نہیں

اِس لئے یہ سوچتا تھا زندگی میں بارہا
پیش اِک سگرٹ بھی تُم لوگوں کو کب میں کر سکا
کیا یہ کم دلچسپ ہے اے سانحو
مَیں سمجھتا تھا کہ تُم مرحُوم ہو
اور تم کھڑکی کے رستے کوٹھڑی میں آ گئے
میری آنکھوں پر غبارِ نُور بن کر چھا گئے
اس لئے کیا اب نہیں بیٹھو گے میرے دوستو
میں خلوصِ دِل سے کہتا ہُوں تمہیں خوش آمدید
ہاشم! اے بھائی مرے عثمان کے لختِ جگر
کِس لئے ہو تُم زبُوں حال و پریشاں اس قدر
سخت حیرت ناک ہے یہ واقعی
کھو چُکے تھے تُم تو اپنی زندگی

سنگ دِل رنج و مصائب کی اندھیری راہ میں
شہرِ استنبول کی شاداب بندرگاہ میں
آہ وہ ظالم جہاز
فتنہ ساماں، فتنہ ساز

جس پہ اِک دِن کوئلے ڈھوتے ہوئے
پاؤں پھسلا تُم اچانک گِر پڑے
ہائے کتنے روح فرسا تھے وہ لمحاتِ ملال
خُون میں بھیگا ہُوا تھا جب تمہارا بال بال
ہَولے ہَولے ڈُوبتی جاتی تھی نبضِ زندگی
کون جانے تھی تمہیں کتنی اذیت اس گھڑی
اِس لئے تم کیوں کھڑے ہو بیٹھ جاؤ میرے پاس
مَیں خلوصِ دِل سے کہتا ہُوں تمہیں خوش آمدید

اور تم یعقوب اے آلام دُنیا کے شکار

اے پہاڑی گاؤں کے باسی اے میرے یارِ غار

مَیں سمجھتا تھا کہ تم بھی مر چکے ہو حلقۂ غم توڑ کر

اپنے بچّوں کے لئے ورثے میں آفاتِ زمانہ چھوڑ کر

گرمیوں کی دوپہر کو ایک گورستان میں

ہم سبھوں نے مل کے دفنایا نہیں تھا کیا تمہیں

لیکن اے یعقوب! تم زندہ ہو اور زندہ رہو

مَیں خلوصِ دل سے کہتا ہُوں تمہیں خوش آمدید

اَور تم احمد جلیل!

اے ادیبِ بے عدیل

میرے ساتھی امیں نے دیکھا اپنی آنکھوں سے تمہیں مرتے ہوئے

اور لوگوں کو تمہاری لاش کو تابوت میں دھرتے ہُوئے

اور شدت سے مجھے احساس یہ ہونے لگا

اپنے قد سے تو تمہیں تابوت بھی چھوٹا ملا

نیچے رکھ دو چبھتے ہو میری اس لاش کو کیوں

ہیں تمہاری وہ بُری عادات اب تک جوں کی توں

نشہ آور شے نہیں

یہ دوا ہے مے نہیں

زندگی کی تلخیوں کو بھول جانے کے لئے

درد کی بڑھتی ہوئی شدت گھٹانے کے لئے

چاکِ دل سیتے تھے تم

کس قدر پیتے تھے تم

مار ڈالا تھا تمہیں تو یورشِ آلام نے

لیکن اب زندہ کھڑے ہو تم بھی میرے سامنے

آؤ آؤ میرے پاس آؤ میرے پیارے جلیل!

میں خلوصِ دل سے کہتا ہوں تمہیں خوش آمدید

اور اپنے شعر میں با افتخار و با جلال

کہہ گیا ہے فارسی کا شاعرِ دیرینہ سال

"عادل و منصف ہے کتنی موت کی خونیں نظر

ایک ہی سا وار کرتی ہے گدا و شاہ پر"

تم اے ہاشم کس لئے حیران ہو

کیا نہیں تم جانتے اس شاہ کو

چند سکوں چند لقموں کے لئے

مر گیا جو کوئلے ڈھوتے ہوئے

اور اپنے شعر میں با افتخار و با جلال

کہہ گیا ہے فارسی کا شاعرِ دیرینہ سال

"عادل و منصف ہے کتنی موت کی خونیں نظر
ایک ہی سا وار کرتی ہے گدا و شاہ پر"
اور تم یعقوب اے بھائی مرے
آج یُوں خندہ بلب ہو کس لئے
کب ہوئے تھے شادماں تم زندگی میں اس طرح
مسکرائے تھے کہاں تم زندگی میں اِس طرح
اور تم احمد جلیل!
اے ادیبِ بے عدیل
چھوڑ دو بوتل دوا کی چھوڑ دو
اپنے غصے کی کلائی موڑ دو
اب یہ غصہ کام آ سکتا نہیں
کیونکہ مجھ کو ہے یقیں

جہاں کئی آہنی ارادے مچل رہے ہیں تباہیوں میں
جہاں کے بیباک باغیوں سے عظیم تر کوئی شے نہیں ہے
وہ سربلند اور عظیم باغی کہ جن کی للکار گونجتی ہے
جہاں کے مرجھائے گل کدوں میں جہاں کے ویران بام و در میں
انہیں کی للکار کی لپک ہے جو چیر کر فاشیت کا سینہ
قدم قدم پر سنا رہی ہے حسین آزادیوں کا مژدہ

فن

تم نے مجھ سے یہ کہا تھا جانِ من!
"تم ابھی اِک خاص مدت کے لئے
جن کی موسیقی بہت پُر شور ہے
سرد کر دو آیسے نغموں کے دِئے

آج تو وہ دور ہے جس میں عوام
ہاؤ و ہو کی تاب لا سکتے نہیں

وُہ تمنائی ہیں سہل الفاظ کے
وہ لُغت میں سر کھپا سکتے نہیں

اُن کو ایسے زمزمے درکار ہیں
جن کے وُہ سائے تلے سستا سکیں
اور جب ہوں سوچ میں ڈوبے ہوئے
دِھیرے دِھیرے وُہ انہیں دُہرا سکیں"

جانتا ہُوں تم کو مجھ سے پیار ہے
بارہا پھر بھی یہی تُم نے کہا
"واقعی یہ چاہتے ہو تُم اگر
دم بخودوں میں بھی تمہارے پیار کا

تو پھر اپنی شاعری کی روح میں
تُم مری تصویر ایسے کھینچ دو
جیسے جیتا جاگتا پیڑا کوئی
جاگزیں سُورج مُکھی کے دِل میں ہو

٭

اور ہر موضُوع کی گہرائی میں
اور اِک موضُوع بھی ہو جلوہ بار
اور گرد خُورشید نو کے نُور کو
مہر و اُلفت کی دُلہن سے ہم کنار"



ناظم حکمت

ناظم حکمت

بعض اوقات مَیں بھی آہیں بھر سکتا ہُوں۔ مَیں بھی
سنہرے بادلوں سے پروتے ہوئے لعلوں کے ہار بنا
سکتا ہُوں۔ لیکن وُہ پری جو میرے شاعرانہ فیضان
کا سرچشمہ ہے اس کے شانوں پہ فولاد کے پر ہیں۔

(ناظم حکمت)

ترکی کا "گاندل"، ناظم حکمت اپنے وطن ہی کا نہیں پوری انسانیت کا عظیم اور تاریخ ساز انقلابی شاعر ہے۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں اس نے ترکی کے ایک تعلیم یافتہ خاندان میں جنم لیا۔ اس کا دادا فارسی زبان کا فاضل اور اپنے وقت کا مشہور موسیقار تھا۔ چنانچہ فارسی زبان اور علمِ موسیقی سے ناظم کا لگاؤ اپنے دادا کا مرہونِ منت ہے۔ اس کی والدہ ایک اعلےٰ پایہ کی مصوّرہ تھی۔ ناظم کی شاعرانہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں اس کی والدہ کا بہت ہاتھ ہے۔

تیرہ سال کی عمر میں ناظم نے شاعری شروع کر دی اور سولہ سال کی عمر میں پہلی دفعہ اس کا کلام منظرِ عام پر آیا۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں انیس سال کی عمر میں اس نے قومی تحریک میں مصطفےٰ کمال کو اپنی خدمات پیش کر دیں اور اناطولیہ کے ایک چھوٹے سے شہر میں اسے معلمی کے عہدے پر معمور کر دیا گیا۔ اناطولیہ میں اسے ترکی کسانوں، مزدوروں اور فوجیوں کی زندگی کو انتہائی قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقعہ ملا۔ اور اس کی شاعری بھی اس ماحول سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوئی۔ اسی دوران میں انقرہ میں ایک مارکسٹ گروپ سے اس کی راہ و رسم پیدا

ہوئی ۔ جس کے توسط سے وہ سوویٹ یونین چلا گیا ۔ وہاں ماسکو یونیورسٹی میں اس نے فلسفے ۔ عمرانیات ۔ اور اقتصادیات کا گہرا مطالعہ کیا ۔ سنہ ۱۹۲۸ء میں جب وہ واپس آیا تو ترکی کی سامراج دوست حکومت نے اسے تین سال کے لئے قید کر دیا ۔

اور سنہ ۱۹۳۷ء میں جب پیرس میں آرٹ دشمن اور کلچر شکن فاشیوں کے خلاف دُنیا بھر کے نمائندہ ادیبوں کا بین الاقوامی اجتماع ہوا ۔ تو اس میں ترکی کے ادیبوں کی طرف سے ناظم نے بھی شمولیت کی اور اس کے فوراً بعد ترکی حکومت نے اسے اس جرم میں اٹھائیس سال کے لئے گرفتار کر لیا کہ حکومت کو اس کی ایسی نظمیں ترک نیوی کے جہازرانوں اور فوجی اکیڈمی کے طالب علموں سے برآمد ہوتی ہیں جو اشتراکیت کا پرچار کرتی ہیں ۔

اس قید کے دوران میں ناظم پر بہت تشدد کیا گیا اور وہ دل کی ایک خوفناک بیماری میں مبتلا ہو گیا اور پھر جب دُنیا بھر کے باشعور عوام میں اس تشدد کے خلاف غصے اور نفرت کا اظہار کیا گیا اور حکومت کے اس فاشی طرزِ عمل پر بھرپور صدائے احتجاج بلند کی گئی ۔ تو جولائی سنہ ۱۹۵۰ء میں ترکی حکومت ناظم کو رہا کرنے پر مجبور ہو گئی ۔

ناظم روسی شاعر مایکافسکی سے بے حد متاثر ہے اور لوئی اراگاں کے الفاظ میں بے شک وہ خود بھی ترکی کا مایکافسکی ہے ۔ کیونکہ اس کی اپنی شاعری میں بھی وہی خروش ۔ عظمت اور بے باکی ہے ۔ جو مایکافسکی کا طرۂ امتیاز ہے ۔

موت

کیا نہیں بیٹھو گے تم اَے میرے پیارے دوستو
مَیں خلوصِ دِل سے کہتا ہُوں تمہیں خوش آمدید
جانتا ہُوں جب مَیں تھا سویا ہُوا
خواب کی دُنیا میں تھا کھویا ہُوا
جیل کی اس سرد و تیرہ کوٹھڑی میں بے خطر
آ گئے تم سامنے والی وہ کھڑکی پھاند کر

جانتا ہوں تم نے وُہ شیشی دوا والی اُٹھائی تک نہیں
ارغوانی گولیوں والی وُہ ڈبیا بھی ہلائی تک نہیں
اپنے ہاتھوں میں لئے اِک دُوسرے کے ہاتھ کو
آ گئے تم میرے بستر کے سرہانے دوستو
ہے تمہارے سب کے چہروں پر ستاروں کی چمک
لالہ زاروں کا تبسم۔ ماہ پاروں کی چمک
کیا نہیں بیٹھو گے تم اے میرے پیارے دوستو
مَیں خلوصِ دِل سے کہتا ہوں تمہیں خوش آمدید
کیا یہ کم دِلچسپ ہے اے ساتھیو
مَیں سمجھتا تھا کہ تم مرحُوم ہو
چُونکہ جنّت اَور جہنّم پہ نہیں میرا یقیں
اَور خدُا سے بھی مری کوئی شناسائی نہیں

اس لئے یہ سوچتا تھا زندگی میں بارہا

پیش اک سگرٹ بھی تم لوگوں کو کب میں کر سکا

کیا یہ کم دلچسپ ہے اے ساتھیو

میں سمجھتا تھا کہ تم مرحوم ہو

اور تم کھڑکی کے رستے کوٹھڑی میں آ گئے

میری آنکھوں پر غبارِ نور بن کر چھا گئے

اس لئے کیا اب نہیں بیٹھو گے میرے دوستو

میں خلوصِ دل سے کہتا ہوں تمہیں خوش آمدید

ہاشم! اے بھائی مرے عثمان کے لختِ جگر

کس لئے ہو تم زبوں حال و پریشاں اس قدر

سخت حیرت ناک ہے یہ واقعی

کھو چکے تھے تم تو اپنی زندگی

سنگ دل رنج و مصائب کی اندھیری راہ میں
شہر استنبول کی شاداب بندرگاہ میں
آہ وہ ظالم جہاز
فتنہ ساماں، فتنہ ساز

جس پہ اک دن کوئلے ڈھوتے ہوئے
پاؤں پھسلا تم اچانک گر پڑے
ہائے کتنے روح فرسا تھے وہ لمحاتِ ملال
خون میں بھیگا ہوا تھا جب تمہارا بال بال
ہوتے ہوتے ڈوبتی جاتی تھی نبضِ زندگی
کون جانے تھی تمہیں کتنی اذیت اس گھڑی
اس لئے تم کیوں کھڑے ہو بیٹھ جاؤ میرے پاس
میں خلوصِ دل سے کہتا ہوں تمہیں خوش آمدید

اور تم یعقوب اے آلام دنیا کے شکار

اے پہاڑی گاؤں کے باسی اے میرے یار غار

میں سمجھتا تھا کہ تم بھی مر چکے ہو حلقۂ غم توڑ کر

اپنے بچّوں کے لئے در آفات زمانہ چھوڑ کر

گرمیوں کی دوپہر کو ایک گورستان میں

ہم سبھوں نے مل کے دفنایا نہیں تھا کیا تمہیں

لیکن اے یعقوب! تم زندہ ہو اور زندہ رہو

میں خلوص دل سے کہتا ہوں تمہیں خوش آمدید

اور تم احمد جلیل!

اے ادیب عدیل

میرے ساتھی میں نے دیکھا اپنی آنکھوں سے تمہیں مرتے ہوئے

اور لوگوں کو تمہاری لاش کو تابوت میں دھرتے ہوئے

اور شدّت سے مجھے احساس یہ ہونے لگا
اپنے قد سے تو تمہیں تابوت بھی چھوٹا ملا
پیچھے رکھ دو چھیڑتے ہو میری اس بوتل کو کیوں
ہیں تمہاری وہ بری عادات اب تک جوں کی توں
نشہ اور شے نہیں
یہ دوا ہے مے نہیں
زندگی کی تلخیوں کو بھول جانے کے لئے
درد کی بڑھتی ہوئی شدّت گھٹانے کے لئے
چاکِ دل سیتے تھے تم
کس قدر پیتے تھے تم
مار ڈالا تھا تمہیں تو یورش آلام نے
لیکن اب زندہ کھڑے ہو تم بھی میرے سامنے

آؤ آؤ میرے پاس آؤ میرے پیارے جلیل!

مَیں خلوصِ دِل سے کہتا ہُوں تمہیں خوش آمدید

اور اپنے شعر میں با افتخار و با جلال

کہہ گیا ہے فارسی کا شاعرِ دیرینہ سال

"عادل و مُنصف ہے کِتنی موت کی خونیں نظر

ایک ہی سا وار کرتی ہَے گدا و شاہ پر"

تُم اے ہاشم کِس لئے حیران ہو

کیا نہیں تم جانتے اس شاہ کو

چند سِکّوں چند لقموں کے لئے

مر گیا جو کوئلے ڈھوتے ہوئے

اور اپنے شعر میں با افتخار و با جلال

کہہ گیا ہے فارسی کا شاعرِ دیرینہ سال

"عادل و منصف ہے کتنی موت کی خونیں نظر
ایک ہی سا وار کرتی ہے گدا و شاہ پر"
اور تم یعقوب اے بھائی مرے
آج یوں خندہ بلب ہو کس لئے
کب ہوئے تھے شادماں تم زندگی میں اس طرح
مُسکرائے تھے کہاں تم زندگی میں اس طرح

اور تم احمد جلیل!
اے ادیبِ بے عدیل
چھوڑ دو بوتل دوا کی چھوڑ دو
اپنے غصے کی کلائی موڑ دو
اب یہ غصہ کام آ سکتا نہیں
کیونکہ مجھ کو ہے یقیں

عادل و منصف ہے ظالم موت کی خونیں نظر

تم تقاضا کر رہے ہو میرے ساتھی کیوں مگر

اس کس لئے تخصیص ہے یہ موت ہی کے واسطے

زندگی بھی خوگرِ انصاف ہونی چاہیئے"

اور اپنے شعر ــــ چھوڑو خیر اب یہ داستاں

یہ مگر کیا جا رہے ہو سب کے سب اب تم کہاں

مجھ سے کیا ناراض ہو اَے دوستو!

جا رہے ہو کیوں رکو اے دوستو!

بیسویں صدی

"کاش سوئے رہیں سو سال تک اے میری ہم"
کون کہتا ہے یہ آواز کہاں سے آئی
میں کوئی بزدل و غدار نہیں ہوں جو مجھے
اپنے ادراک کی منظور ہو یوں رسوائی

اس ستم خوردہ صدی سے میں ہراساں تو نہیں
سُرخ ہیں نکبت و افلاس سے جس کے رخسار

جس میں عظمت بھی ہے قوّت بھی ہے ہیجان بھی ہے
ایک باغی سے بہت ملتا ہے جس کا کردار

بلکہ نازاں ہوں کہ اس دَور کا فرزند ہوں میں
قبل از وقت نہیں ہے مری ہستی کی نمود
خُوش نصیبی ہے مری مَیں بھی ہُوں ان کا ساتھی
اک نئی زیست کی تخلیق ہے جن کا مقصود

اپنے ماحول کے اندوہ و الم کے باوصف
میری محبوب! ایَں حالات سے مایوس نہیں
جگمگاتی ہے اندھیرے میں مرے ذہن کی ضو
میرا ایمان مستقبل مجھ کو دلاتا ہے یقیں

اس صدی سے بھی نری جھومتی آنکھوں کی طرح
دُھوپ پھوٹے گی در و بام درخشاں ہونگے
سو برس تک تو کہاں اس سے بہت پہلے ہی
اپنے لمحاتِ سیہ فام درخشاں ہونگے

ایک خط

(بیوی کے نام)

مَیں نے کل اے میری پیاری تم کو دیکھا خواب میں
تم نے اپنا سر اُٹھایا یک بیک
اور دُھندلائی ہُوئی آنکھوں سے دیکھا میری سمت
کپکپاتے تھے تمہارے نرم و نم آلود ہونٹ
باوجُود اس کے تمہاری دِل نشیں آواز کب مَیں سُن سکا

رات کے گہرے اندھیرے میں کہیں

گونجتا ہے آہنی گھڑیال خوش آئند خبروں کی طرح

اور سن سکتا ہوں میں

کھیت کے پرلی طرف

اپنی اُس چڑیا کی "میمورا گنی"

سُرخ پنجرے میں ہے جو اب تک اسیر

اور سُن سکتا ہوں میں

اپنی دھرتی سے نئے سُرخ کر اُگنے والے ان گنت بیجوں کا شور

اور ابد کی سنسناہٹ کو فضائے تیرہ میں سرگوشیاں کرتے ہوئے

اور اک پاکیزہ ہنگامہ کسی بڑھتے ہوئے انبوہ کا

کپکپاتے تھے تمہارے نرم و نم آلود ہونٹ

باوجود اس کے تمہاری دِل نشیں آواز کب میں سُن سکا
ایکا ایکی بڑبڑا کر ہو گیا بیدار میں
پڑھتے پڑھتے آگئی تھی نیند سی
کیوں مگر ان سب صداؤں اور اس گونجار میں
میرے کانوں تک تمہاری ہی صدا پہنچی نہیں

تمہارے ہاتھ

اے لوگو! یہ ہاتھ تمہارے
پتھر کے مانند بہت گمبھیر ہیں لیکن
افسردہ اور غمگیں بھی ہیں
زنداں کے نغمات ہوں جیسے
بوجھ اُٹھانے والے جانوروں سے بڑھ کر
باہمت ہیں اور قوی ہیں

بھوکے بچّوں کے جوشیلے چہروں سے ہیں
شہد کی مکھّی جیسے ہُنر مند اور جفاکش
بھاری بھرکم ـــــــ دودھ بھرے سینے ہوں جیسے
اور بہادر ـــــــ جیسے فطرت

ان ہاتھوں کی ساری نرمی
چھپی ہوئی ہے
اپنی سخت اور کھردری کھال کے اندر

گائے کے سینگوں پر یہ دُنیا کھڑی نہیں ہے
ہاتھ تمہارے تھامے ہوئے ہیں اس کو
اے بد قسمت سادہ لوگو!
جھوٹ کے دسترخوان ہمیشہ

تم کو پیش کیے جاتے ہیں
جب کہ تمہارے پیٹ ہیں خالی
روٹی کے اک اک ٹکڑے کو

ترس رہے ہو
ہر دم تم کو بھوک کے شعلے
جھلس رہے ہیں
اور تم اس پیلی دنیا کو
اور اس کے خوش رنگ پھلوں کو
یونہی چھوڑ کے مر جاتے ہو

اے بد قسمت سادہ لوگو!
ایشیا- افریقہ اور مشرقِ وسطیٰ کے اے لوگو!

اور اے میرے وطن کے رہنے والو!

تم جو سب سے بڑا حصہ ہو اس دنیا کا

اپنے ہاتھوں ہی کی طرح ہو

سوچ میں ڈوبے بوڑھے بوڑھے

پھر بھی اپنے ہاتھوں کے مانند ہو پُر جوش اور جواں تم

اور اے لوگو! یورپ اور امریکہ والو!

تم ہو بہادر اور پھرتیلے

پھر بھی اپنے ہاتھوں کے مانند ہو سیدھے سادے بھولے بھالے

جلد ہی دھوکا کھا جاتے ہو

آسانی سے مکر کے جال میں پھنس جاتے ہو

اے لوگو! اے سادہ لوگو!

بول رہے ہیں جھوٹ اگر یہ چھاپے خانے

بول رہے ہیں جھوٹ اگر اخبار، کتابیں اور رسالے

بول رہی ہیں جھوٹ اگر ان گرجا گھروں کے
پادریوں کی نیک دُعائیں

بول رہی ہیں جھوٹ اگر ان سیمیں پردوں پر لہراتی
چھم چھم کرتی ———
ماہ وشوں کی ننگی ٹانگیں

بول رہے ہیں جھُوٹ اگر سب خواب تمہارے

بول رہے ہیں جھُوٹ اگر میخانے کے مدہوش مغنّی

بول رہی ہے جھُوٹ اگر وہ چاندنی شب بھی
آتی ہے جو ایک اذیت دینے والے دِن کٹنے پر

بول رہے ہیں جھُوٹ اگر الفاظ لغت کے

بول رہی ہیں جھوٹ اگر دلکش آوازیں

بول رہے ہیں جھوٹ اگر دن رات تمہارے ہاتھوں کی محنت کے ڈاکو

اور اگر ہر چیز ہے جھوٹی

اور اس جھوٹ کے اندھیارے میں

صرف تمہارے ہاتھ صداقت کی شمعیں ہیں

تو پھر اس کا مطلب یہ ہے

چاہتے ہیں وہ —— ہاتھ تمہارے

مٹی جیسے بے قیمت بے حس بن جائیں

اور اندھیرے کے مانند یہ بے نور اور اندھے ہو جائیں

دور رہیں یوں عقل و خرد سے

جیسے تعاقب میں بھیڑوں کے دوڑنے والے جاہل کتے

تاکہ نہ بھڑکیں ان میں بغاوت کے انگارے

اور ان میں احساس کی کوئی لہر نہ دوڑے
تاکہ اس ہر لمحہ بدلتی
سحر انگیز حسین دُنیا میں
جہاں ہماری زیست کی مُہلت نہیں زیادہ
سرمائے کے جبر و تشدد کی زنجیریں ٹوٹ نہ جائیں

جشنِ انقلاب

میں جشنِ روزِ مبارک کے بعد مدت تک
عجیب بات نہیں ہے جو زندہ رہ جاؤں

میں جشنِ روزِ مبارک کے بعد مدت تک
سفید داڑھی کے لیے کر نشان ٹھوڑی پر
اگر جہانِ دلِ آویزسے بچھڑ نہ سکا

تو کوچے کوچے میں دیوار و در کے سائے تلے
قدم قدم پہ سناؤں گا وائلن ان کو
جو انقلاب کی منزل پہ کامراں پہنچے

ہر ایک سمت بھران سحر کار راتوں میں
مہکتے ہنستے ضیا بار راستے ہوں گے
نئے عوام کے قدموں کی آہٹیں ہوں گی
نئے نویلے طرب ناک زمزمے ہوں گے